نقشِ نو

۲۰۱۵ء - ۲۰۱۶ء

سالانہ عالمی اردو جریدہ

شعبۂ اردو

حمیدیہ گرلز ڈگری کالج الہ آباد

الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

Scanned with CamScanner

نقشِ نو

سالانہ عالمی اردو جریدہ

شمارہ ہشتم

۲۰۱۵ء ۔ ۲۰۱۶ء

مدیر: ناصحہ عثمانی　　　معاون مدیر: زرینہ بیگمؔ

شعبۂ اردو

حمیدیہ گرلز ڈگری کالج

الہ آباد سنٹرل یونیورسٹی، الہ آباد۔ یو۔ پی۔ انڈیا

Scanned with CamScanner

'نقشِ نو' سالانہ عالمی اردو جریدہ ۔ شمارہ ہشتم

سرپرست: مسز تزئین احسان اللہ

نگراں: ڈاکٹر ریحانہ طارق

مجلسِ مشاورت:

پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی

ڈاکٹر مامون ایمن

ڈاکٹر احتشام عباس حیدری

مجلسِ ادارت:

اعزازی مدیر — پروفیسر عبدالحق

مدیر — مسز ناصحہ عثمانی

معاون مدیر — مسز زرینہ بیگم

معاونین:

ڈاکٹر یوسف نفیس

ڈاکٹر ندرت محمود

ڈاکٹر شبانہ عزیز

فرح ہاشم

کمپیوٹر کمپوزنگ: مسز شمیمہ یاسمین

ناشر: شعبۂ اردو، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج، نوراللہ روڈ، الہ آباد۔ یو۔ پی۔ انڈیا

فون نمبر: 0532-2656526 موبائل نمبر: 9559258741

ای میل: hamidia_alld@yahoo.co.in

naseha29@yahoo.co.in

ISSN 2320-3781 Naqsh-E-Nau

قیمت: اندرونِ ملک 100 روپئے ، بیرونِ ملک 10 ڈالر (ڈاک خرچ الگ)

'نقشِ نو' کے مشمولات میں ظاہر کردہ نفسِ مضمون سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

(جملہ حقوق بحقِ شعبۂ اردو، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج محفوظ ہیں۔)

Scanned with CamScanner

فہرست

نمبر شمار	عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
۱۔	اپنی بات	مسز ناصحہ عثمانی	۱
۲۔	جلال لکھنوی کی غزل گوئی کے امتیازی عناصر	ڈاکٹر ای۔اے۔حیدری	۳
۳۔	قومی جذبوں کا نقیب: نوبت رائے نظر	ڈاکٹر لئیق رضوی	۱۱
۴۔	۱۹ویں صدی کا ادبی لکھنؤ اور منشی دوارکا پرساد افق	ڈاکٹر بشریٰ بانو	۱۷
۵۔	جموں کشمیر میں اردو کے ابتدائی آثار	رضوانہ شمسی	۲۳
۶۔	لکھنوی عہد کے ممتاز شعرا: صفی لکھنوی اور ثاقب لکھنوی	ڈاکٹر احسان حسن لکھنوی	۳۰
۷۔	فن داستان پر ایک نظر	مسز ناصحہ عثمانی	۳۶
۸۔	قلی قطب شاہ کی شاعری میں ہندوستانی عناصر	مسز زرینہ بیگم	۴۸
۹۔	اقبال کے اردو اشعار میں ذکر انبیا	ڈاکٹر بندرت محمود	۵۹
۱۰۔	علامہ اقبال کے کلام میں عورت	ڈاکٹر شبانہ عزیز	۷۲
۱۱۔	تہذیبوں کا زوال ایک تلخ حقیقت	فرح ہاشم	۸۳
۱۲۔	ہندوستان کے مسلم معاشرہ پر تصوف کے اثرات	ڈاکٹر صدیقہ جابر	۹۱
۱۳۔	تہذیب نسواں کی خدمات	ڈاکٹر نزہت فاطمہ	۱۰۲
۱۴۔	افق اور آرزو لکھنوی	ڈاکٹر عصمت نیلوانصاری	۱۱۶
۱۵۔	کلام اقبال میں آدم علیہ السلام	محمد شاہد خان	۱۲۰
۱۶۔	لکھنؤ کی عزاداری اور اس سے وابستہ چند پہلو	کائنات انصاری	۱۲۵

Scanned with CamScanner

اپنی بات

اردو محض ایک زبان نہیں بلکہ ایک تہذیبی وراثت کی امین بھی ہے۔ ایک لمبے عرصے تک اس زبان نے ہندوستان کے پڑھے لکھے طبقے پر حکمرانی کی ہے۔ مہذب گھرانے کے لوگوں کا خواہ سائنس، ٹکنالوجی، میڈیکل یا کسی اور شعبۂ زندگی سے تعلق ہو لیکن اردو پر ان کی دسترس یقینی تھی۔ شعر و شاعری اور ادب لطیف کا ذوق ہر گھر ہر مزاج میں ہوتا تھا۔ لوگوں کے ذہن میں وہ دن آج بھی خزانے کی طرح محفوظ ہوں گے جب شمع، بیسویں صدی، بانو، جاسوسی دنیا اور مجرم جیسے رسالوں کو پڑھنے کے لئے اردو سیکھی جاتی تھی ان کی حصولیابی کے لئے جھگڑے ہوتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اس وقت کچھ بھی حقیر کہہ کر مسترد نہیں ہوتا تھا۔ جسے آج کا ادب نواز طبقہ تفریحی ادب کا نام دے رہا ہے یہی تفریحی ادب فروغ اردو زبان میں معاون ہوتا تھا بچے نے پڑھنا شروع کیا تو ہلال، کھلونا جیسے رسالے اس کے ہاتھ میں تھما دئے جاتے تھے جنہیں وہ پہلے بڑوں سے سنتا پھر رفتہ رفتہ خود پڑھنے لگتا اور نہ معلوم کب وہ جنون پیدا ہو جاتا کہ ادھر اخبار والے نے 'کھلونا' ڈالا ادھر سب کچھ بھول کر ہم اس میں گم ہو گئے۔ تھوڑا بڑے ہونے پر 'نور' اور پھر 'شمع'، 'بیسویں صدی'، 'بانو'، 'جاسوسی دنیا' اور 'مجرم' تو نوعمر لڑکے لڑکیوں کے دلوں کی دھڑکن بنے رہتے تھے۔ اس طرح اردو گھروں میں پھلتی پھولتی رہتی اور کسی کی کسی مشقت کے بغیر اردو کا پودا سرسبز و شاداب رہتا۔ بشریٰ رحمٰن کی 'لگن' کی اگلی قسط کے لئے دن گنے جاتے۔ اے۔ حمید رضیہ بٹ، عادل رشید، اے۔ آر۔ خاتون کے نئے ناول کا بے صبری سے انتظار ہوتا۔ کرنل فریدی اور کیپٹن حمید کے نئے کارنامے کے لئے دل بے چین رہتا لیکن پھر ادب کا بٹوارہ ہو گیا بے حد کرب ناک تفریحی ادب اور معیاری ادب پڑھنے کے معیار بدلے، شمع کی ضخامت کم ہوئی پھر بند ہو گیا 'بیسویں صدی' اور 'بانو' کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ جاسوسی دنیا بھی بند ہو گئی۔ 'کھلونا' اور 'نور' پہلے ہی اپنا وجود کھو چکے تھے اب نئی نسل اپنی کم عمری میں قرۃ العین حیدر،

Scanned with CamScanner

کرشن چند، سریندر پرکاش وغیرہ جیسے بلند قامت فکشن نگاروں سے تو مطالعہ کے شوق کی شروعات نہیں کر سکتے نتیجتاً اردو کا شوقِ مطالعہ کم ہونے لگا۔ نئے دور نے تفریح کے نئے سامان مہیا کئے۔ نئے برقیاتی اور تکنیکی نظام نے نئی دنیا، نئی روشنی دی اور ہم اردو کی تنزلی کی ذمہ داری سرکار پر چھوڑ کر اپنی ذمہ داری سے بری ہو گئے۔ ہر بات کا الزام سرکار کے سر۔ اب کوئی پوچھے ہم اپنے بچوں کو ان کی مادری زبان سے دور کر رہے ہیں تو سرکار کیا کرے؟ لیکن اپنی غلطیوں سے چشم پوشی کا اس سے اچھا کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا کاش ہم خوابِ غفلت سے جاگ جائیں اور سمجھ سکیں کہ گیسوئے اردو ہنوز منت پذیر شانہ ہے۔

اس ماہ نے یکے بعد دیگرے کئی صدمے اردو دنیا کو دئے پہلے معروف صحافی اور فکشن نگار عابد سہیل نے اس دارِ فانی سے کوچ کیا پھر اردو کے بڑے فنکار اور افسانوں میں نئی طرز کے موجد انتظار حسین دنیائے افسانہ نگاری میں نا قابلِ تلافی خلا پیدا کر گئے اور ۸ر فروری کو نئے دور کے بے حد معروف شاعر ندا فاضلی نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ 'نقشِ نو' کی مجلس ادارت انہیں دلی خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے تہہ دل سے دعا گو ہے کہ خدا مرحومین کو اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

ناصحہ عثمانی

Scanned with CamScanner

جلالؔ لکھنوی کی غزل گوئی کے امتیازی عناصر

انیسویں صدی کا لکھنؤ تاریخ میں اپنی تہذیب وتمدن اور ثقافت ورواداری کے ساتھ ساتھ مذہبی شاعری کے لئے بھی بہت اہمیت رکھتا ہے اس لئے کہ اس عہد میں لکھنؤ کے افق شاعری پر آتشؔ وناسخؔ کے ساتھ ساتھ انیسؔ ودبیرؔ بھی آفتاب وماہتاب کی طرح روشن ومنور تھے اور مرثیہ گوئی کا یہ سلسلہ ان کے بعد بھی بیسویں صدی کی ابتدا تک اسی آب وتاب کے ساتھ جاری رہا اگر ایک طرف انیسؔ ودبیرؔ مرثیہ کو ادبی سطح پر بلند کرنے اور اسے فروغ ووسعت دینے کی سعی کررہے تھے اور اردو شاعری کے ذخیرے میں رزمیہ داخل کررہے تھے اور اس سے سماجی وسیاسی سطح پر بیداری لانے کی کوشش کررہے تھے تو دوسری جانب غزل کے میدان میں آتشؔ وناسخؔ اور ان کے شاگردوں کے درمیان معرکہ آرائی اپنے شباب پر تھی، ان غزل گویوں کی مکمل توجہ فنی مہارت، عروضی نزاکتوں اور زبان وبیان کی صحت وصفائی پر تھی لکھنؤ کے اسی شعری وادبی ماحول میں جلالؔ نے شاعری کا آغاز کیا۔

حکیم ضامن علی جلالؔ لکھنوی کا شمار لکھنؤ کے استاد شعرا میں ہوتا ہے وہ ابتدا ہی سے دبستان ناسخؔ سے وابستہ ہوگئے تھے اور آخر وقت تک وابستہ رہے مگر حتی الامکان اپنے کلام کو ناسخؔ کے اس رنگ سے محفوظ رکھنے کی سعی کی ہے جس میں سپاٹ پن اور بے کیفی ہے۔ جلالؔ نے ابتدا میں امیر علی خاں ہلالؔ سے مشورۂ سخن کیا مگر یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک برقرار نہ رہ سکا اور وہ میر اوسط علی رشکؔ کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوگئے پروفیسر محمد حسن کی اطلاع کے مطابق رشکؔ کی عراق روانگی تک جلالؔ نے مشق شعر میں کافی دسترس بہم پہنچائی تھی پھر بھی انہوں نے نواب فتح الدولہ برقؔ کی شاگردی اختیار کی۔ [1]

مشق شعر وسخن اور اپنی شوخیٔ طبع وجدت کی بنا پر جلد ہی جلالؔ نے اہل لکھنؤ سے اپنے

ڈاکٹر ای۔اے۔حیدری، ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اردو، گورنمنٹ لوہیا پی۔جی۔کالج، چورو

Scanned with CamScanner

شعری کمال کو منوالیا۔ اس کا ثبوت وہ مشاعرہ ہے جس میں ہلالؔ و جلالؔ دونوں موجود تھے اور جب ہلالؔ سے غزل پڑھنے کے لئے کہا گیا تو انہوں نے غزل پڑھنے سے پہلے یہ کہا کہ ''آپ کے سامنے کیا پڑھوں'' اس پر جلالؔ نے جواب دیا کہ ''آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں میں وہی جلالؔ ہوں جس نے آپ سے اصلاح لی ہے'' اس واقعہ سے جلالؔ کے کمال فن اور اس عظمت و رفعت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو انہیں اس وقت لکھنؤ میں حاصل تھی یہ وہ زمانہ ہے جب اسیرؔ، برقؔ، بحرؔ، رشکؔ، قلقؔ، آبادؔ، رندؔ، صباؔ، خلیلؔ، آغا حجو شرفؔ اور پنڈت دیا شنکر نسیمؔ جیسے ارباب فن لکھنؤ میں موجود تھے ان باکمالوں کی موجودگی میں یہ عظمت و بزرگی حاصل کرنا آسان ہرگز نہ تھا۔

غزل کا بنیادی موضوع حسن و عشق ہے لیکن محض اسی کی ترجمانی میں غزل کی عظمت و مقبولیت پوشیدہ نہیں اس کی شہرت و رفعت کا راز یہ ہے کہ اس نے حسن و عشق کی متنوع و مختلف کیفیات کی ترجمانی کی ہے۔ زندگی کے مختلف ادوار میں حسن و عشق کے جو تصورات رہے ہیں ان سب کی تفصیل غزل میں موجود ہے۔ غزل نے اپنے آپ کو حسن و عشق تک ہی محدود نہیں رکھا وہ اس دائرے سے باہر بھی نکلی ہے اور ماورائی اور مابعد الطبیعاتی موضوعات کو بھی اپنے دامن میں جگہ دی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو غزل میں معاملات تصوف کی ترجمانی نے ایک مستقل رجحان کی صورت اختیار نہ کی ہوتی، بعد کو اسی تصوف کے وسیلے سے حیات و کائنات کے بے شمار مسائل کی ترجمانی کا باب وا ہوا۔

اردو غزل میں جدت کا رنگ سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تہذیبی تبدیلیوں کا ہی مرہون منت ہے۔ سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تہذیبی تبدیلیوں کے لئے انگریزوں کی ہندوستان آمد اور استحکام سلطنت کا واقعہ ہمارے ملک کی تاریخ کا ایسا موڑ ہے جس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ انگریزوں کی ہندوستان آمد کے ساتھ ہی مغربی افکار و نظریات نے ہماری زندگی میں تبدیلی کے آثار پیدا کر دیئے۔

یوں تو انگریز بہت پہلے اس ملک میں داخل ہو گئے تھے لیکن انیسویں صدی کی ابتدا میں جب ان کے قدم دہلی میں جمنے لگے تو اس سے ہماری زندگی میں تبدیلی کا عمل تیز سے تیز تر ہوا اور

Scanned with CamScanner

غیر شعوری طور پر ہی سہی لیکن غزل بھی ان حالات سے متاثر ہوئی ۔اس عہد کی غزلوں میں صحت مند تصورات کی جو لہر دکھائی دیتی ہے وہ انہیں اثرات کا نتیجہ ہے۔

یہ دور اس لحاظ سے بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے کہ اس دور میں مسلمانوں کے اندر بیداری کی لہر پیدا ہوئی کچھ کر گزرنے کی تمنا, اپنی نفس کا عرفان اور اس عرفان نفس سے کام لینے کا احساس عام ہوا۔اس عہد میں جو نیم مذہبی یا نیم سیاسی تحریکیں نمودار ہوئیں ان کے پس پشت انہیں حالات کا عمل دخل تھا۔سید احمد بریلوی اور مولانا اسماعیل کی تحریکوں نے مادی سطح پر اگر چہ مسلمانوں کو کوئی بڑا فائدہ نہیں پہنچایا مگر ان کا یہ کارنامہ بھی کم اہم نہیں کہ انہوں نے لوگوں کے دلوں میں عزم و حوصلے کے چراغ روشن کئے ۔ہندوستان اور بالخصوص دہلی کے ان حالات نے زندگی کے عام انداز کو جس طرح بدلا, نظریۂ حیات میں جس طرح انقلاب پیدا کیا اور فکر و خیال کی جو نئی راہیں پیدا کیں اس کے اثرات جلاؔل پر بھی مرتب ہوئے جس کے سبب ان کی شاعری میں ان کے معاصرین مثلاً وزیرؔ، منیرؔ، تسلیمؔ، برقؔ، منشی مظفر علی اسیرؔ اور امیر مینائیؔ وغیرہ کے برعکس فکری پہلو زیادہ ہے۔ان کی غزلیں صاف و سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ مختصر ہیں اور قافیہ پیمائی اور لکھنوی غزل کے روایتی مضامین بھی ان کے یہاں بہت کم ہیں ۔جلاؔل کے دواوین کا مطالعہ کرنے پر یہ حقیقت بھی روشن ہوتی ہے کہ وہ اپنے معاصرین کی طرح دو غزلے اور سہ غزلے بھی نہیں کہتے جن کا اس عہد میں عام رواج تھا۔بطور مثال یہ اشعار دیکھئے۔

جو پوچھتا ہوں رہ کوئے یار کہتے ہیں خضر
تمھیں نہیں ہو غریب الدیار ہم بھی ہیں

عشق گو کافر بنا دیتا ہے مومن کو مگر
اک گلے میں سبحہ و زنار دو رہتے نہیں

طور موسیٰ دیکھ کر کیوں تجھ کو جلتا ہے جلاؔل
ایک کے کیا طالب دیدار دو رہتے نہیں

کیا پتا دوں تجھے قاصد وہ کہاں رہتا ہے
دل سے دور اور قریب رگ جاں رہتا ہے

بے وفائی کرے ہزار وہ گل
نہ چھپے گی وفا کی بو مجھ سے

جس سے اظہار محبت کرو بنتا ہے عدو
اس سے کچھ عشق کی تاثیر بگڑ جاتی ہے

Scanned with CamScanner

محبت کو لازم ہے آوارگی بھی نہیں عشق کرتا اثر بیٹھے بیٹھے

غزل کے ان اشعار میں روایت کا رچا ہوا انداز موجود ہے مگر اس کے باوجود ان میں وہ خارجیت اور سپاٹ انداز نہیں جس کے لئے شعرائے لکھنؤ طنز و تعریض کا نشانہ بنے۔ ان کے یہ خیالات صرف تفنن طبع کا نتیجہ نہیں، بلکہ ان میں زندگی کی تبدیل ہوتی ہوئی اقدار و افکار کا عکس بھی جھلکتا ہے مثال کے طور پر ان کے یہ اشعار بھی ملاحظہ کیجئے۔

کشور الفت میں سب کی ایک سی ہے منزلت ساتھ بجتا ہے یہاں ڈنکا گدا و شاہ کا

پتا اس نے دیا تیرا، ملا جو عشق میں خود گم خبر تیری اسی سے پائی جس کو بے خبر پایا

بڑے ساماں سے دل جستجو کو اس کی نکلا ہے چلا ہے لے کے اک مجمع نظر ہائے پریشاں کا

کدورتیں بھی ہوئیں سر کے ساتھ دل سے جدا کسی نے ہاتھ لگایا ہے کیا صفائی کا

اسی کے گھر تھے دل و چشم و عرش و کعبہ و دیر کدھر تلاش کو جاتا جلالؔ ششدر تھا

ہوں وہ بلبل کہ صدا سن کے مرے نالوں کی دل پکڑ لے گا اگر باغ میں صیاد آیا

پھرے جو آپ کس آفت کا سامنا نہ ہوا حریف بخت بنا منحرف زمانہ ہوا

منفعل وہ تو ہوا کچھ بھی نہ بیداد کے بعد ہم کو البتہ ندامت ہوئی فریاد کے بعد

پروردگار دینی ہے راحت اگر مجھے پیدا نئی زمین نیا آسمان کر

صیاد جب قفس سے نکالا تھا بہر ذبح پوچھی تو ہوتی مرغ گرفتار کی ہوس

وہ سب جگہ ہے دیکھنے کو آنکھ چاہئے ہر کوہ کو سمجھتے ہیں رتبہ میں طور ہم

درج بالا اشعار کی روشنی میں اس نتیجے تک بآسانی پہنچا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے لکھنوی معاصرین سے مختلف ہیں مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جلالؔ نے اپنی شاعری کی ابتدا لکھنوی رنگ سخن سے کی تھی اس لئے کہ جلالؔ کو لکھنؤ میں رہ کر شاعری کرنا تھی اور اہل لکھنؤ سے داد و تحسین حاصل کرنا تھی ایسی صورت میں لکھنوی رنگ سخن کو اختیار کرنا ان کے لئے ناگزیر تھا پھر بھی ان کے یہاں وہ سپاٹ پن اور معشوق کے حسن ظاہر کا تذکرہ بہت کم ہے اس لئے کہ انہوں

Scanned with CamScanner

نے بہت جلد یہ محسوس کرلیا تھا کہ خارجیت کا رنگ شاعری میں درد و اثر کی کیفیت اور دل کشی پیدا نہیں کرسکتا، لہٰذا انہوں نے روش عام سے انحراف کیا۔

جلالؔ نے اصلاح زبان اور محاورات کے استعمال کی سطح پر ناسخؔ کی روش پر چلنے کی کوشش کی ہے، لغت و عروض اور قواعد وغیرہ کی کئی کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں جس کے سبب غزلوں میں بھی قواعد پر خصوصی توجہ دی ہے، تلفظ، تذکیر و تانیث، محاورات و عروض کے مسائل ہمہ وقت ان کے پیش نظر رہتے۔ جلالؔ نے علمی اعتبار سے زبان کو منظم کرنے کی بڑی کدوکاوش کی اور اپنے معاصرین کے درمیان ایک اہم اور نمایاں مقام حاصل کیا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے، انتزاع سلطنت اودھ اور واجد علی شاہ کی معزولی نے اودھ اور خاص طور پر لکھنؤ کی رونق کو جس طرح ختم کیا اس کے سبب شعرائے لکھنؤ کے کلام میں مرض، نزع، موت، نوحہ، ماتم، ساکنان خاک کی بستی، مدفن، گور غریباں، فنا، طوق، زنجیر، خنجر، قاتل، گلشن، آشیاں، گل چیں، صیاد اور قفس وغیرہ لفظیات و علائم کا استعمال جس طرح عام ہوا ہے وہ ان شعرا پر غالب ہوتی ہوئی عبرت کا اثر معلوم ہوتا ہے ثبوت کے طور پر صفیؔ، عزیزؔ، ثاقبؔ، سراجؔ اور آرزوؔ لکھنوی وغیرہ کی غزلیں پیش کی جاسکتی ہیں مگر اسی کے دوش بدوش کہیں کہیں اس صورت حال اور انگریزوں کے خلاف عوام میں جو نفرت اور غم و غصہ تھا اس کا بھی اظہار ہوا ہے۔ حکیم ضامن علی جلال کی غزلوں میں بھی یہ اثر اپنی ابتدائی شکل میں موجود ہے مثال کے طور پر ان کے درج ذیل اشعار دیکھئے۔

ہزاروں باتیں میں صیاد کو سناتا ہوں
زبان کھل گئی جب سے قفس میں بند ہوا

آہِ بلبل نے قفس پھونکا تو کیا
آگ لگتی خانۂ صیاد میں

ہوش گم ہیں مری وحشت سے یہ حدّادوں کے
طوق بنتا نہیں زنجیر بگڑ جاتی ہے

گل چیں اجاڑنے کو اگر آشیانہ ہو
بلبل اسے خود آگ لگا کر روانہ ہو

۱۸۵۷ء کے انقلاب کی نوعیت محض سیاسی نہیں تھی تہذیبی، علمی، ادبی اور سماجی بھی تھی

Scanned with CamScanner

جس نے اگر بہت کچھ ہم سے سلب کیا تو ہمیں بہت کچھ سیکھنے پر بھی مجبور کیا۔ ایک بساط اٹھی تو دوسری اس کی جگہ بچھ گئی اور حالات کچھ اتنی برق رفتاری سے بدلے کہ ادب و شاعری میں تبدیلی کا جو عمل انیسویں صدی میں دہلی میں شروع ہو چکا تھا اس کی رفتار تیز سے تیز تر ہو گئی۔ انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تو نئے طبقے پیدا ہوئے، نئے افکار و نظریات عام ہوئے جنہوں نے نئے مسائل کو جنم دیا۔ دراصل یہ ایک عبوری دور تھا جس میں اپنے حالات کو بدلنے کے لئے جدوجہد کا عمل بھی شروع ہوا اسی کے نتیجہ میں شعری روایات کو سنوارنے اور نکھارنے اور نئی روایات کو وجود میں لانے کا شعور بھی بیدار ہوا۔

مولانا حالؔی نے غزل کی اصلاح کی جانب خصوصی توجہ کی، انہوں نے غزل کی عظمت و رفعت اور وسعت و برتری کا صحیح احساس دلایا اور اسی احساس کے نتیجے میں غزل میں نئی راہیں کشادہ ہوئیں۔ جلال غیر شعوری طور پر ان سے متاثر ہوئے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو محض لکھنوی شعرا کی تقلید و پیروی تک محدود نہیں رکھا بلکہ داخلیت اور فکری عناصر کی آمیزش سے اپنا ایک الگ رنگ سخن قائم کرنے کی کوشش کی جس میں درد و اثر کی کیفیت موجود ہے اور درد و اثر کی اس کیفیت میں وہاں اور بھی اضافہ ہوتا ہے جہاں کہیں وہ تبدیل ہوتے سماجی و معاشرتی حالات کے زیر اثر ماضی کی بازیافت اور المیہ موضوعات کو اپنی غزل میں داخل کر کے رنگ میرؔ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

انیسویں صدی کے ربع آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں اردو غزل میں جس طرز میرؔ کی پیروی کی بات نقادوں نے کی ہے اس کی جھلک جلالؔ کے دیوان سوم اور چہارم میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہے اور ان کے اس رنگ کو ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے علاوہ پروفیسر سید اعجاز حسین نے بھی محسوس کیا ہے ڈاکٹر اعجاز کے بقول ایک حصہ جلال کے کلام کا ایسا ہے جس میں انہوں نے میرؔ کی تقلید کی ہے جس میں تاثیر و سادگی و معنویت نہایت خوبی سے نمایاں ہیں۔ ۲

نمونہ کے طور پر ان کے دیوان اوّل کی ایک غزل کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے۔

وہ دل نصیب ہوا جس کو داغ بھی نہ ملا ملا وہ غم کدہ جس میں چراغ بھی نہ ملا

Scanned with CamScanner

گئی تھی کہہ کے میں لاتی ہوں زلف یار کی بو
پھری تو باد صبا کا دماغ بھی نہ ملا

اسیر کر کے ہمیں کیوں رہا کیا صیاد
وہ ہم صفیر بھی چھوٹے وہ باغ بھی نہ ملا

خبر کو یار کی بھیجا تھا گم ہوئے ایسے
حواس رفتہ کا اب تک سراغ بھی نہ ملا

بھر آئے محفل ساقی میں کیوں نہ آنکھ اپنی
وہ بے نصیب ہیں خالی ایاغ بھی نہ ملا

چراغ لے کے ارادہ تھا بخت کو ڈھونڈیں
شب فراق تھی کوئی چراغ بھی نہ ملا

دیوان دوم کی غزلوں کے یہ اشعار بھی ملاحظہ کیجئے۔

بعد مدت کے خیال دل ناشاد آیا
آج بھولا ہوا اک دوست ہمیں یاد آیا

دل شب ہجر کے نالوں کا مزہ جانتا ہے
منھ کو ہر بار کلیجہ دم فریاد آیا

نیم جاں چھوڑ چلے وہ، ملک الموت آئے
ایک جلاد گیا دوسرا جلاد آیا

ہوں وہ بلبل کہ صدا سن کے مرے نالوں کی
دل پکڑ لے گا اگر باغ میں صیاد آیا

مجھ سا بد بخت کوئی مرغ چمن کیا ہوگا
موسم گل کی دعا مانگی تو صیاد آیا

وحشت دل نے کیا آپ سے باہر جس دن
ڈھونڈھتے ہوں گے مرے طوق وسلاسل مجھ کو

☆☆☆

کوئی فرقت میں انیس کنج تنہائی نہیں
ایک وحشت وہ بھی کچھ پھرتی ہے گھبرائی ہوئی

☆☆☆

نالے دلیل درد ہیں حاصل بیاں سے کیا
دل تو پکارتا ہے کہوں میں زباں سے کیا

اے ضعف، نقش پا کی طرح تھک کے راہ میں
جس در پہ بیٹھ جائے اٹھے وہاں سے کیا

تنہائی لحد ہے پس مرگ اور ہم
ہوتی تھی پہلے وحشت اکیلے مکاں سے کیا

دو گز زمین دے نہ سکا کوئے یار میں
امید رکھیں اور ہم اس آسماں سے کیا

☆☆☆

مار ڈالا ذکر گلشن چھیڑ کر صیاد نے
آج میں کنج قفس میں کیا پھڑک کر رہ گیا

Scanned with CamScanner

دل بھر آیا رو سکے لیکن نہ بزم یار میں　　چشم تر سے ایک آدھ آنسو ٹپک کر رہ گیا
شمع کام آئی شب تاریک فرقت میں نہ داغ　　یہ بھی جل کر بجھ گئی وہ بھی چمک کر رہ گیا
کس جگہ مجھ کو دغا دی طاقت پرواز نے　　دو قدم پر تھا در گلشن کہ تھک کر رہ گیا

☆☆☆

کیا اس نے سنی ہوگی شب غم کی حکایت　　جو حرف تھا فریاد ہوا آ کے زباں تک

پہلے اور دوسرے دیوان کے ان اشعار کو پڑھ کر اگر کسی شاعر کا نام ذہن میں آتا ہے تو وہ میر تقی میرؔ کا ہے اس لئے کہ موضوعات کے ساتھ ساتھ اسلوب میں بھی میرؔ کا سا انداز موجود ہے فرق صرف درد و اثر کی کیفیت کا ہے اور یہ رنگ ان کے تیسرے اور چوتھے دیوان میں اور گہرا ہوا ہے اور جلالؔ کا یہی رنگ و آہنگ اردو شاعری کی تاریخ میں انہیں ان کے معاصرین سے ممتاز و منفرد کرتا ہے۔ جلالؔ نے میر کے اس رنگ کو تبدیل ہوتے سماجی، معاشرتی، اقتصادی وسیاسی منظرنامے کے تحت غیر شعوری طور پر اختیار کیا ہے۔

نئی غزل میں روایت میر کی بازیافت کا جو عمل شعوری یا غیر شعوری طور پر ناصر کاظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی، ابن انشاء، احمد مشتاق اور منیر نیازی وغیرہ کے یہاں در آیا ہے اسے ہمارے نقادوں نے فراقؔ کے حزنیہ لہجے کا اثر بتایا ہے حالانکہ یہ حزنیہ لہجہ تو فراقؔ کے معاصر فانیؔ بدایونی اور انور حسین آرزوؔ لکھنوی کے آخری دور کے کلام میں بھی موجود ہے۔

عصر حاضر میں جس روایت میرؔ کی بازیافت کی بات کی جاتی ہے اسے انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں تازہ کار بنانے میں جلالؔ نے اہم کردار ادا کیا ہے جس کے سبب عصر حاضر میں جلالؔ کی اہمیت و عظمت میں اور بھی اضافہ ہوتا ہے۔

حواشی:

۱۔ جلال لکھنوی، از پروفیسر محمد حسن　　ص۔ ۱۵
۲۔ مختصر تاریخ ادب اردو، از ڈاکٹر سید اعجاز حسین　　ص۔ ۱۲۳

Scanned with CamScanner

قومی جذبوں کا نقیب: نوبت رائے نظرؔ

نوبت رائے نظرؔ کثیر الجہات تخلیقی صلاحیتوں کے فنکار تھے۔ وہ منفرد لب ولہجہ کے شاعر و ادیب ہی نہیں صاحب طرز صحافی بھی تھے۔ اردو نظم کی تنظیم میں ان کا اہم حصہ ہے۔ ادبی صحافت کے تو وہ بنیاد گزاروں میں شامل ہیں۔ زبان و بیان پر بے پناہ قدرت اور اپنی خلاقانہ طبیعت کے سبب نظرؔ نے ان دونوں ہی میدانوں میں اپنے نقش قدم چھوڑے ہیں۔ ایسے تابندہ نقوش، جن کی چمک آج بھی ماند نہیں پڑی ہے۔

۱۹ویں صدی کا آخری ربع ہندوستان کی تاریخ کا انتہائی نازک موڑ ہے۔ سیاسی اور سماجی دونوں سطحوں پر اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ ۱۸۵۷ کی شکست اور اس کے بدلے میں ٹوٹے فرنگیوں کے قہر کے زخم ابھی تازہ تھے۔ مایوسیوں نے ہونٹ سی دیے تھے۔ پھر احیائے مذاہب کے نام پر مختلف تحریکیں شروع ہوئیں۔ شدت پسندی کے جھکڑ خیر سگالی کی فضا کو جھک جھور رہے تھے اور اسی کی کوکھ سے جنم لے رہے تھے اردو اور ہندی کے سوال۔ ایسے میں اردو شعر و ادب نے نئی انگڑائی لی۔ حالیؔ، اکبرؔ، شبلیؔ اور اسماعیلؔ میرٹھی جیسے شعرا امیدوں کے نئے چراغ لے کر سامنے آئے۔ پیرایہ اظہار بھلے ہی الگ الگ رہے ہوں، لیکن ان سب کا مقصد کہیں نہ کہیں ایک ہی تھا، مایوسیاں اور جمود توڑ کر قوم کو درپیش چیلنجز سے ہوشیار کرنا۔ حب الوطنی اور جذبۂ حریت کو ابھار کر قوم کو انگریزوں کے خلاف صف آرا کرنا۔ یہ سیاسی بیداری کا نیا تڑکا تھا، جس نے شعر و ادب کی نئی جہتیں متعین کیں۔ نوبت رائے نظرؔ کی قومی شاعری کا خمیر بھی انہیں افکار سے اٹھتا ہے۔

نظرؔ کی تخلیقی کائنات کم و بیش نصف صدی پر محیط ہے۔ انہوں نے تمام اصناف سخن میں

ڈاکٹر لئیق رضوی، نوئیڈہ، یو۔پی۔ laeeqrizwi@yahoo.co.in

Scanned with CamScanner

طبع آزمائی کی اور نیچرل اور قومی شاعری کا قابل قدر سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔نظر کی شاعری قدیم اور جدید کا حسین سنگم ہے۔انہوں نے روایت سے استفادہ تو کیا لیکن جدت طبع سے نئی راہیں بھی استوار کیں۔نظر نے مضامین کے تنوع سے شاعری کے دامن کو وسعت بھی دی اور اس میں فکر وفن کے گل بوٹے بھی ٹانکے۔نظر نے جس دور میں لکھنا شروع کیا،نظم نئی کروٹ لے رہی تھی۔مضامین اور برتاؤ دونوں سطحوں پر تجربے ہو رہے تھے۔سوز وطن نظموں کو بھی گرمانے لگا تھا۔نظر لکھنوی بھی اس سے اچھوتے نہیں رہے۔کبھی اڈورڈ ہفتم کی تاج پوشی پر قصیدہ لکھنے والا یہ شاعر یوں گویا ہوا تھا:

فلک پہ شرر بار کا دھواں دیکھو۔زمیں پہ نقش قدم ہائے رفتگاں دیکھو
ہوا میں اک تتق گرد کارواں دیکھو۔فضائے دہر میں تم شور الماں دیکھو
جگر کے پار غریبوں کی آہ ہوتی ہے
کہ آج قوم کی کشتی تباہ ہوتی ہے

کہاں گئی تری عظمت وہ آہ مادر ہند۔کہ تجھ سے کانپتے تھے بادشاہ مادر ہند
ملا نہ سکتے تھے تجھ سے نگاہ مادر ہند۔یہ مہر و ماہ ہیں اب تک گواہ مادر ہند
تری زمین پہ گردوں سے دیوتا آئے
ترے پہاڑ پہ جنت سے انبیا آئے

خدا کرے کہ ہوائے قوم تجھ کو بھی احساس
ترے بھی سینہ میں ایسا ہی دل ہو فرض شناس
برادران وطن کا تجھے بھی ہو کچھ پاس
کسی کے پیٹ کو روٹی نہ جسم پر ہے لباس

Scanned with CamScanner

یہی ہے وقت تری جوشش حمیت کا
کہ یہ سوال ہے ہندوستاں کی عزت کا

(ہندیان جنوبی افریقہ)

نوبت رائے نظر قومی جذبوں کے نقیب بھی ہیں۔ایک ایسے دور میں جب حب الوطنی اور آزادی کا ذکر آسان نہیں تھا، انہوں نے قومی احساسات کو زبان دینے کی کوشش کی ہے۔یہ براہ راست کم ہے اور در پردہ زیادہ۔'تیغ ہندی' نظر کی ایسی ہی نظم ہے، جہاں وہ علامتوں کے سہارے جہاد بالسیف کی تلقین کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

کون سے گوشہ میں ہے اے تیغ ہندی تو نہاں
دھوم تھی تیری روانی کی میان دو جہاں
تیرا لوہا مانتے تھے اہل یوناں، اہل روم
خوف سے تیرے ہوئی فوج سکندر نیم جاں
اہل یورپ سے بھی جوہر تیرے پوشیدہ نہیں
مرہٹوں کے ہاتھ میں تھی اژدر آتش فشاں
ہے تعجب زنگ کیوں کر کھا گیا فولاد کو
تیرے جوہر مٹنے والے تھے نہ زیر آسماں
ذکر تیرے کارناموں کا ہے جس تاریخ میں
فی الحقیقت حرف حرف اس کا ہے اب تک خوں چکاں
ملک مالا مال تھا جب تک کہ تھی تو ہاتھ میں
تیرے ہی دم سے تھا یہ ہندوستاں جنت نشاں

(تیغ ہندی)

نظر کے ان اشعار میں گھن گرج تو نہیں لیکن تخاطب کا انداز اور بیان کی کیفیت انھیں بیشک انقلابی لہجہ عطا کرتی ہے۔ حب وطن اور آزادی کی للک ان کے کلام میں بکھری پڑی ہے۔ نظر کی نظموں میں ہی نہیں ان کی غزلوں اور قطعات میں بھی اس طرح کے اشعار مل جاتے ہیں:

بلبل سے کوئی پوچھے دل بستگی چمن کی
انساں نہیں وہ جس کو الفت نہ ہو وطن کی

یہ طوق اسیری دیوانو! زینت دہ گردن ہو کب تک
انساں ہے وہی آزاد ہے جو، آزاد نہیں تو کچھ بھی نہیں

☆☆☆

دبی ہوئی ہیں جو قومیں ذلیل ہیں یکسر
کچل رہے ہیں زبردست ان کو مستی میں

☆☆☆

چوستی ہیں غیر ملکی کمپنیاں خون ملک
چپکے چپکے نکلے جاتا ہے فراوں خون ملک

☆☆☆

زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہے اک جہاں
جنگ ہستی چاہتی ہے عقل کے تیر و کماں
ہندیوں کو بھی مصاف زندگی ہے ناگزیر
لے کے نکلیں ہاتھ میں فہم و فراست کا نشاں

نظر لکھنوی نے فرقہ وارانہ تعصب کے خلاف بھی آواز بلند کی ہے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ جنگ آزادی کی دھار کو کند کرنے کے لیے دشمنوں کی ایک چال ہے۔ انہوں نے قوم کو اس سے

Scanned with CamScanner

بازر کھنے کی کوشش کی۔

ہند میں جنگ مذاہب ہے نہایت پر خطر
سم قاتل سے نہیں کم ملک پر اس کا اثر
کر رہے ہیں واعظان قوم ہنگامہ بپا
شور محشر کا نمونہ ہے یہ لفظی شور و شر

نوبت رائے نظرؔ امن عالم کے خواہاں ہیں۔ ظلم و جور کی صورتیں انہیں بے چین کر دیتی ہیں اور درد اشعار میں یوں ڈھل جاتا ہے ۔

دنیا میں جا کے امن کہاں ڈھونڈھیے نظرؔ
چاروں طرف سے آگ لگی ہے زمانے میں

☆☆☆

ساری دنیا کی زمیں بستر گل ہے لیکن
ہم جس آرام کے طالب ہیں وہ آرام نہیں

اصلاح معاشرہ نوبت رائے نظرؔ کی شاعری کا دوسرا اہم موضوع ہے۔ انہوں نے تعلیم بالخصوص تعلیم نسواں کی ضرورت پر بار بار زور دیا ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب بچیوں کی مکتبی تعلیم کی صورتیں عام نہیں تھیں۔ نیز بعض حلقوں میں انہیں مناسب بھی نہیں سمجھا جاتا تھا، نظرؔ کے یہ اشعار انقلابی سوچ اور دور بیں نگاہوں کے غماز ہیں۔

لڑکیوں کے واسطے تعلیم کا ہو انتظام
ہو معین درس کا ان کے لیے بھی اک مقام
عورتیں جاہل رہیں گی تو بنے گا کچھ نہ کام
ہے ترقی کا اصول لازمی تعلیم عام

Scanned with CamScanner

مرد اگر تعلیم پائیں عورتیں جاہل رہیں
دعویٰ تہذیب جتنے ہیں وہ سب باطل رہیں

ایک سچے ادیب کی طرح نوبت رائے نظرؔ کی انگلیاں زمانے کی نبض پر رہیں۔انہوں نے اشعار اور مضامین کے سہارے قومی جذبوں کی ترجمانی کی ہے۔نظرؔ قومی اردو کی قومی شاعری کی اہم کڑی ہیں۔ان کے اشعار حالیؔ، اسماعیلؔ اور شبلیؔ کے دور کو چکبستؔ، حسرتؔ اور اقبالؔ کے عہد سے فکری ربط دیتے ہیں۔قوم میں سیاسی شعور بیدار کرنے اور آزادی کی للک جگانے میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا ہے لیکن افسوس کہ ان گراں قدر خدمات کے باجود نظرؔ کو بھلا دیا گیا۔ان کے کلام اور مضامین کا ایک حصہ اب بھی اخبار و جرائد میں بکھرا ہوا ہے۔ضرورت ہے انہیں تلاش کرنے۔ان کی تدوین اور اشاعت کی۔ان کی ادبی قدر و قیمت متعین کرنے کی۔نظرؔ پر ابھی ویسا کام بالکل نہیں ہوا جس کے وہ حقدار تھے۔ان کی ادبی خدمات کا خاطر خواہ جائزہ اور ادبی قدر و قیمت کا تعین اردو تحقیق اور تنقید کے ناخن پر اب بھی قرض ہے۔

Scanned with CamScanner

۱۹ویں صدی کا ادبی لکھنؤ اور منشی دوار کا پرساد آفق

لکھنؤ عیش ونشاط کا مرکز رہا ہے۔ ۱۸۵۷ کی خونی داستان کے بعد کافی شعرا لکھنؤ چلے گئے۔ چونکہ لکھنؤ سیاسی انقلاب سے بچا تھا اس لئے وہاں کی شاعری میں تکلف وتصنع موجود تھا۔ جس طرح دبستانِ دہلی اپنی داخلیت کے لئے مشہور ہے، ٹھیک اسی طرح دبستان لکھنؤ اپنی خارجیت کے لئے مشہور ہے۔ دہلی اسکول سے وابستہ شعرا نے اردو شاعری کو فارسی کی ڈگر پر چلانے کی کوشش کی اور تصوف اور اصل موضوعات کو اہمیت دی۔ جب کہ لکھنؤ اسکول سے وابستہ شعرا نے رنگ رلیوں اور شوخیوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اس دور کی دہلی تباہ تھی اور آئے دن وہاں شورشیں اٹھتی تھیں۔ اس کے لئے وہاں کے شعرا مستقل مزاج اور ایک دوسرے کے غم گسار ہو گئے تھے۔ اس کے برعکس لکھنؤ کے شعرا کے کلام میں نزاکت کا رنگ اور محبوبیت کا سلیقہ پایا جاتا تھا اور لکھنؤ کے ماحول میں کافی آسودگی اور فراوانی پائی جاتی تھی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس وقت کے لکھنؤ کو ہندوستان کا جنت تصور کیا جاتا تھا۔

لکھنؤ اپنا ہے گویا خلد از
ہر قدم پر شوخیاں ہیں ہر قدم پر بہار ہے

ان کی شاعری میں نزاکت کا رنگ، محبوب کا بناؤ سنگار اور زمانے کی رنگا رنگی نظر آئی اور خارجیت نے اتنا زور پکڑا کہ غزل سے داخلیت ختم ہوگئی اور دردِ دل جو بیان کیا وہ بھی خارجیت کے لباس میں۔ اس طرح محبوب کے لباس، اس کی ادائیں، اس کی ظاہری خصوصیات کا بیان ہونے لگا۔ مثال کے لئے ناسخ کا شعر ملاحظہ ہو۔

دے دوپٹہ تو اپنا مل مل کا
ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

ڈاکٹر بشریٰ بانو، ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اردو، مہیلا پی جی کالج لکھنؤ

Scanned with CamScanner

غرض جو خصوصیت جان غزل تھی لکھنؤ نے اس کو رخصت کر دیا۔ اس دور کے ہر شاعر نے شاعری کو ایک کھیل بنا کر پیش کیا۔ وہ تو عیش و عشرت کے ماحول کے پروردہ تھے اور اس ماحول کی جتنی خامیاں ہو سکتی تھی وہ سب کی سب ان کی شاعری میں بھی آ گئیں۔ لکھنؤ کے بعض ایسے شعرا تھے جو غزل میں مشکل پسندی کو جائز نہیں قرار دیتے تھے۔ وہ آسان اور نرم الفاظ استعمال کرنا چاہتے تھے۔ ان کی ذہنیت بہت پست تھی۔ وہ چھیڑ چھاڑ کے اشعار کہتے تھے۔ جسے عام طور پر معاملہ بندی کہتے ہیں۔ یعنی محبوب سے کس طرح کی گفتگو ہوئی اور اس نے کیا جوابات دیے۔ یہ معاملہ بندی کبھی کبھی بازاری پن پیدا کر دیتی تھی اور دور۔ دور تک شرم و حیا کا نام نہیں رہتا تھا۔

لکھنؤ میں طویل غزلوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۵-۱۵ اشعار کی غزل کہہ لینا تو ان کے لئے معمولی بات تھی۔ کبھی کبھی وہ قافیہ بدل کر دو غزلہ اور سہ غزلہ بھی کہہ لیتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ وہ شاعر بہت ممتاز مانا جاتا تھا جو مشکل زمینوں میں طویل غزلیں کہہ لے اور اپنا انداز بیان پیچیدہ رکھے۔

انداز بیان میں لکھنؤ والوں نے غیر معمولی تبدیلیاں کیں۔ صرف وہ مشکل الفاظ ہی نہیں استعمال کرتے تھے بلکہ بات کہنے میں بھی وہ مشکل پسندی سے کام لیتے تھے انھوں نے تشبیہ وغیرہ بھی ایسی استعمال کیں کہ آسانی سے مفہوم واضح نہ کر سکیں۔ غرض جو چیزیں شاعری میں اچھی مانی جاتی تھیں یعنی تشبیہ و استعارات، لکھنؤ آ کر وہ بھی برباد ہو گئیں۔

مختصر یہ کہ لکھنؤ کے شعرا نے خارجیت کی طرف زیادہ زور صرف کیا اور محبوب کو محبوب حقیقی کے بجائے محبوب مجازی کے روپ میں پیش کیا۔ اس طرح فارسی کی عینک لگا کر دیکھنے والوں کو یہ انداز بڑا رومانی معلوم ہوا لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ یہاں شعرا نے محبوبیت کے آئینے میں آسمان میں اڑنے کے بجائے زمین سے اپنے جذبات و خیالات کو استوار کیا۔ یہ صحیح ہے کہ اردو شاعری کی اصلاح دہلی کے شعرا نے کی ہے لیکن اردو شاعری کو نزاکت کا رنگ اور محبوبیت کا سلیقہ دے کر اور اسے رنگ و روغن عطا کر کے لکھنوی شعرا نے اردو شاعری کے حسن کو دوبالا کر دیا۔

لکھنؤ اسکول کے صحیح بانی ناسخ ہیں۔ لکھنؤ میں انشا اور مصحفی کے بعد ناسخ اور آتش

Scanned with CamScanner

دو بڑے پہلوان ادبی اکھاڑے میں نمودار ہوئے۔ لکھنویت کا رنگ اگر دیکھنا ہے تو وہ ان ہی شعرا کے کلام میں نظر آئے گا۔ بقول آل احمد سرور:

''لکھنوی شاعری نے میر، سودا، نظیر و اقبال جیسے دیوزاد نہیں پیدا کیے۔ بلکہ آتش، انیس، وناسخ جیسے جوہری اور مینا کار پیدا کئے۔''

اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی پنڈت دیا شنکر نسیم تھے جو آتش کے شاگرد تھے۔ چونکہ لکھنؤ کے بادشاہ اور نوابین شیعہ مسلک کو ماننے والے تھے اس لیے یہاں مرثیہ نگاری کے فن کو بھی بہت فروغ ملا۔ مرثیہ نگاری کے دو قد آور شاعر میر انیس اور مرزا دبیر نے صنف مرثیہ نگاری کو بام عروج تک پہونچا دیا۔

ہندوستان کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس جنگ آزادی کو ہم ایک بڑے انقلاب سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہر انقلاب کے بعد ملک وقوم کو بہت سی آزمائشوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو اس انقلاب کے بعد تین بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ماضی کی بندشوں سے نکل کر نئے حالات کو قبول کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہونا، انگریزوں کا اعتماد حاصل کرنا اور پھر تعلیمی و معاشی معاملات میں دوسری قوموں کا مقابلہ کرنا۔ اسی غدر نے جہاں ہندوستانیوں کو بے بس اور مجبور بنا دیا تھا، وہاں اسی نے انھیں جینے کا نیا حوصلہ، علم وادب کی تحقیق اور اس کی پرکھ کا نیا شعور بخشا۔ یہی شعور منظم طور پر علی گڑھ تحریک کی شکل میں پروان چڑھا۔

علی گڑھ تحریک نے روایت پرستی کے طلسم کو توڑا اور شعر وادب میں جذباتیت اور تقلید کے بجائے عقل پسندی اور ارضیت کو فروغ دیا۔ اس تحریک سے جہاں اردو نثر متاثر ہوئی اور وہ عبارت آرائی کے دائرے سے باہر نکلی وہیں اس تحریک کے زیر اثر شاعری کا انداز بھی بدلا اور وہ قافیہ پیمائی اور لفاظی کے کوچے سے نکل کر اظہار خیال کا سچا ذریعہ ثابت ہوئی۔ مجموعی طور پر اس تحریک کو اردو ادب کے دور زریں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس دور میں متعدد ایسے شعرا و ادبا نے

Scanned with CamScanner

جنم لیا جنھوں نے اردو ادب کے ذخیرے میں بیش بہا اضافے کئے۔ سرسید احمد خاں، محسن الملک، وقار الملک، سمیع اللہ خاں، الطاف حسین حالؔی، نذیر احمد، ذکا اللہ خاں، محمد حسین آزادؔ، چراغ علی، شبلی نعمانی اور وحید الدین سلیم وغیرہ براہ راست یا بالواسطہ طور پر اسی دور کے نمائندہ قلم کار ہیں۔

حالؔی کا شمار اردو لٹریچر کے عناصر خمسہ میں ہوتا ہے۔ اگر چہ عناصر خمسہ کی اصطلاح مہدی افادی کی ایجاد کردہ ہے جسے ان کی ذہنی اپج کا ایک نمونہ کہا جا سکتا ہے لیکن غدر کے بعد اردو شعر و ادب نے جو ترقی کی ہے اگر وہ پیش نظر رکھی جائے اور سرسید، نذیر احمد، شبلی، حالؔی اور محمد حسین آزادؔ نے جو خدمات انجام دی ہیں اگر ان کا جائزہ لیا جائے تو مہدی افادی کی یہ اصطلاح بہت ہی مناسب اور مقتضائے حال کے مطابق ثابت ہوتی ہے۔

حالؔی کی ادبی سرگرمیوں کا میدان بہت وسیع ہے۔ ایک طرف انھوں نے ''حیاتِ سعدی'' ''حیاتِ جاوید'' اور ''یاد گار غالب'' جیسی سوانح عمریاں اردو کو دیں۔ ''مقدمہ شعر و شاعری'' کا لوہا تو کلیم الدین احمد جیسے سخت گیر نقاد نے بھی مانا تو دوسری طرف شاعری کو نئے رنگ و آہنگ سے آشنا کیا اور مناجاتِ بیوہ، چپ کی داد اور ''مسدس مدو جزر اسلام'' جیسی نظمیں لکھیں۔ اب تک شاعری چند مخصوص اصناف سخن کی پابند تھی اور ردیف و قافیہ کے پیش نظر اشعار کہے جاتے تھے مگر کرنل ہالرائڈ کی تحریک اور خود علی گڑھ تحریک کے زیر اثر منظومات کا رواج ہوا جسے حالؔی نے بے نمک کا سالن اور ابالی ہوئی کھچڑی سے تعبیر کیا تھا لیکن بدلتے ہوئے زمانے میں اسی کی ضرورت تھی۔ چونکہ غزل اردو شاعری کا مزاج بن چکی تھی اس لئے اسے بالکل ختم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حالؔی نے مقدمہ شعر و شاعری کے ذریعہ غزل کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور یہاں تک کہہ دیا کہ یا تو عمارت میں ترمیم ہوگی یا عمارت خود نہ ہوگی حالؔی کی اس آواز پر جس بڑے شاعر نے سب سے پہلے لبیک کہا وہ ہیں حسرتؔ موہانی۔ انھیں بجا طور پر جدید غزل کا امام کہنا چاہیے۔ انھوں نے غزل کے روایتی ڈھانچے میں نئے خیالات اور نئے جذبات کو جگہ دی۔ ان کی شاعری سچ مچ اسی زمین اور اسی علاقے کی شاعری تھی جس میں ہم سانس لے رہے ہیں۔ انھوں نے غزل میں

Scanned with CamScanner

عقل پسندی کو راہ دی اور سچے انسانی جذبات کی نمائندگی کا حق ادا کیا۔

امیر مینائی اور داغ دہلوی یہ دو ایسے شاعر ہیں جنھوں نے ابھی تک سرسید تحریک سے اثر قبول نہیں کیا اور پرانے انداز کی شاعری ہی سے جڑے رہے۔ امیر مینائی کی شاعری میں لکھنؤ کی سلاست، شیرینی نفاست، نزاکت، روانی اور بامحاورہ زبان کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ داغ دہلوی کی شاعری لکھنؤ کی شیریں بیانی کے ساتھ ساتھ دہلوی شاعری کی سادگی اور سلاست کا بہترین امتزاج ہے۔

غرض اس دور میں اردو کے شعری اسلوب میں فارسی کی مشکل بیانی کے بجائے آسان اردو کی روش اختیار کرنے پر زور دیا جانے لگا۔ جس میں ہندوستانی تہذیب و تمدن، حبِ وطنی سماجی اصلاح اور قومیت اور وطنیت کا نعرہ بلند کیا جا رہا تھا۔

اردو ادب کے اسی پس منظر میں افق اردو ادب پر چمکتا ہوا ایک نایاب، تابناک، درخشندہ ستارہ۔ ملک الشعراء منشی دوارکا پرساد افق جس کے بغیر لکھنؤ کا علمی و ادبی سفر مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ فارسی اور اردو کے مشہور شاعر اور نثر نگار منشی پورن چند ذرہ کے فرزند ارجمند تھے۔ افق کی پیدائش ۱۸۶۴ میں لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ اردو کا شعری و نثری سرمایہ، دونوں ان کا مرہون منت ہے۔ ادبی ماحول انھیں وراثت میں ملا تھا۔

افق کا کمال فن یہ ہے کہ انھوں نے اس ادبی میراث میں نہ صرف قابل قدر اضافہ کیا بلکہ اسے ترقی و ارتقا کی اس منزل تک پہونچا دیا جہاں لکھنؤ کا ادبی سرمایہ ہمیشہ کے لئے ان کا قائل ہو گیا۔ قدرت نے ان میں ایسی صفات ودیعت کی تھیں کہ وہ نہ صرف ایک مشہور ناول نگار، عمدہ ڈراما نویس، قابل قدر صحافی تھے بلکہ اعلیٰ درجے کے مترجم، کامیاب مورخ اور بلند ترین طنز و ظرافت نگار بھی تھے۔ عالم تصویر، کادمبری، طلسم، زلف لیلیٰ، انقلاب، فتنہ اور شہزادی ان کے مشہور ناول ہیں۔ رامائن، کرشن سدامان کے کامیاب ڈرامے ہیں۔ اردو صحافت نگاری میں اخبار ''نظم'' نے ان کے فن صحافت کو بیش بہا جلا بخشی۔ یہ اخبار اپنے طرز کا واحد اخبار تھا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ساری خبریں شاعری کے طرز پر چھپتی تھیں۔ اردو ترجمہ نگاری بھلا افق

Scanned with CamScanner

کی علمی و ادبی دسترس سے غافل کیسے رہ سکتی تھی۔ والمیکی رامائن، مہابھارت، ٹاڈ راجستھان کا انھوں نے اردو میں کامیاب ترجمہ کیا جس نے عوام وخواص دونوں میں قدر ومنزلت حاصل کی۔

نثر کے علاوہ افق کا شعری سرمایہ بھی کم وقعت نہیں رکھتا۔ افق نے اپنے شعری سفر کی ابتدا غزلوں سے کی۔ ان کی ابتدائی غزلوں میں امیر مینائی اور داغ دہلوی کی غزلوں کا عکس دکھائی دیتا ہے مگر بہت جلد انھوں نے فنِ غزل کو خیر باد کہہ کر اردو شاعری کی مشکل ترین اصناف مسدس اور مثنوی کی طرف رجوع کیا۔ رباعیات اور قصائد پر طبع آزمائی کی اور اس طرح اردو کے لکھنوی شعری وادبی سرمائے کو بام عروج تک پہونچا دیا۔ مشاہیر نے انھیں اس طرح خراج تحسین عطا کیا ہے۔ بقول سید مسعود حسن رضوی ادیب:

> ''جناب افق نے مختلف حیثیتوں سے شعر وادب کی بڑی خدمت کی۔ وہ کئی اخباروں کے ایڈیٹر رہے، کئی ناول تصنیف کئے، کئی مختصر سوانح عمریاں لکھیں، رسالوں میں مضامین شائع کئے، گیت بنائے، ڈرامے لکھے، اہم کتابوں کے اردو میں ترجمے کئے اور خاص طور پر شاعری میں شہرت حاصل کی۔''

بقول سید احتشام حسین:

> منشی دوارکا پرساد افق لکھنوی اپنے دور میں ادبی افق کے روشن ستاروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ انھوں نے اردو زبان وادب کے کئی گوشوں کو منور کیا اور شعر وادب کے ذریعے ان تہذیبی قدروں کی ترجمانی بھی کی جس کے روشن پہلوؤں کے وہ رازداں تھے۔''

بقول جوشؔ ملیح آبادی:

> ''حضرت افق کو کون نہیں جانتا۔ مطلع شاعری پر آج بھی آپ کا آفتاب دمک رہا ہے اور ہمیشہ دمکتا رہے گا۔''

Scanned with CamScanner

جموں کشمیر میں اردو کے ابتدائی آثار

اردو زبان نے جہاں ہندوستان کی متعدد ریاستوں اور دنیا کے دیگر ممالک میں اپنے پر پھیلائے وہیں کشمیر کو بھی اپنی آغوش میں لیا۔ ریاست جموں کشمیر میں اردو زبان کی جڑیں اتنی اندر تک پیوست ہوگئیں کہ وہ مواصلاتی نظام کے استحکام کے شانہ بہ شانہ چلتے ہوئے اتنی سرعت سے اس مقام و مرتبہ کو پہنچ گئی کہ ہم اس زبان کو فخر سے ہندوستان کی واحد ریاستی سرکاری زبان ہونے کے اعزاز سے یاد کرتے ہیں۔

جب ہم ریاست جموں کشمیر میں اردو کے ابتدائی نقوش کی بات کرتے ہیں تو ہمیں مغل دور سے ہی ملنے لگتے ہیں اگر چہ اس وقت پروان چڑھنے والی زبانوں میں فارسی اہم ترین زبان تھی اور دفتری کاموں کے لئے استعمال ہوتی تھی مگر جہاں تک رابطے کی بات ہے اردو عوامی زبان رہی جو بتدریج ترقی کرتے ہوئے اس مقام تک پہنچی کہ اردو ادب کا اتنا وسیع سرمایہ دیا۔

> ''اصل میں مغل دور ہی سے اردو کا چلن وادی میں شروع ہوگیا تھا جو بتدریج عروج پکڑتا گیا۔ اردو کی خدمت کرنے میں ان کشمیریوں کا بہت اہم رول رہا ہے جو وادی سے نکل کر ملک کے دوسرے حصوں میں آباد ہوگئے تھے۔''

(مضمون موتی لعل ساقی کشمیر میں علاقائی زبانیں اور اردو (1995 گولڈن جبلی نمبر میں صفحہ 86)

کشمیر میں اردو کے فروغ کے لئے بلا لحاظ مذہب وملت ہر ایک نے صرف کوشش ہی نہیں کی بلکہ اس کے درخت کو ثمر آور بنانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں رہا لہٰذا ہم دیکھتے ہیں جب انگریزوں کا تسلط ہندوستان پر قائم ہوگیا تو انہوں نے 16 مارچ 1846 میں مہاراجہ گلاب سنگھ کو عہد نامہ امرتسر کی رو سے نانک شاہی 75 لاکھ مالیات کے ٹکے

رضوانہ شمسی، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، الہٰ آباد یونیورسٹی، الہٰ آباد

Scanned with CamScanner

عوض کشمیر کو ان کے حوالے کر دیا۔ چنانچہ ڈوگرہ راجہ گلاب سنگھ نے انگریزوں سے کشمیر کو خرید لیا اور پھر مہاراجہ گلاب سنگھ نے عملی طور پر اردو کے فروغ کے لئے جو کارہائے نمایاں انجام دیے اس کو کسی بھی حال میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے ودیا پریس قائم کر کے اردو کی دن دونی رات چوگنی ترقی کے لئے راہیں ہموار کر دیں اس پریس کے قیام سے اردو زبان کے فروغ میں ایک نیا موڑ آیا۔ شروعات میں تو اس پریس سے سرکاری حکم نامہ، عدالتی اسٹامپ پیپر، ڈاک ٹکٹیں وغیرہ ہی اردو میں شائع ہوئیں، مہاراجہ گلاب سنگھ کے بعد رنبیر سنگھ گدی پر بیٹھا۔ رنبیر سنگھ کے زمانے میں اردو دوسرے کاموں کے لئے بھی استعمال ہونے لگی جس سے اردو کی مزید ترقی ہوئی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کو اردو سے اتنی دلچسپی تھی کہ انہوں نے ریاست میں اردو کا ذوق پیدا کرنے کے لئے کئی مہتمم بالشان کارنامے انجام دیے جس میں قابل ذکر ان کا قائم کردہ دارالترجمہ اس لئے قائم کیا گیا تھا تا کہ اردو جدید علوم کو اپنے دامن میں سمیٹ سکے اور وہ جدید علوم وفنون کی تعلیم کا متحمل ہو سکے جس نے اردو کی ترقی میں چار چاند لگا دیے اور اردو نے مختلف علوم وفنون تک اپنا دائرہ وسیع کیا۔ اس میں زمانۂ قدیم کی کتابوں کے ساتھ جدید علوم وفنون کی مختلف کتابیں بھی ترجمہ کی گئیں۔ پروفیسر عبدالقادر رقم طراز ہیں۔

> ''مہاراجہ رنبیر سنگھ کی ساری دلچسپیاں ریاست میں اردو کو ذوق پیدا کرنے کے سلسلے میں اہمیت رکھتی ہیں لیکن اس میں سب سے زیادہ مہتمم بالشان کام ان کا قائم کیا ہوا دارالترجمہ یا محکمۂ تالیف وترجمہ تھا جو مغربی علوم کو ریاست کی زبانوں اور خاص کر اردو میں منتقل کرنے کے مقصد سے قائم کیا گیا تھا۔''

(عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو حصہ دوم جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز ص۔ ۱۳۸)

Scanned with CamScanner

1885 میں رنبیر سنگھ کی وفات ہوگئی اور پرتاپ سنگھ تخت نشین ہوا۔ 1888 میں پرتاپ سنگھ کے دور حکومت میں اردو کو ریاست جموں کشمیر میں سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوگیا۔ جموں کشمیر میں اردو زبان کے ارتقائی سفر کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہاں پر بھی شاعری کی اولیت کا غلبہ کام کرتا نظر آتا ہے۔ اسی تناظر میں یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ یہاں شاعری کے آثار سترہویں صدی کے اواخر سے ہی ملنا شروع ہو جاتے ہیں۔ لیکن اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز میر کامل الدین اندرابی رسوا سے ہوتا ہے، عبدالقادر سروری اس بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''میر کمال الدین اندرابی رسوا سے کشمیر میں اردو کے ترقی یافتہ ادب کا آغاز ہوتا ہے رسوا اورنگ زیب کے آخری عہد کے کشمیری انشاء پردازوں اور شاعروں میں نمایاں مقام رکھتے تھے وہ کم و بیش شمالی ہند کے ابتدائی دور کے لکھنے والوں جعفر زٹلی اور فضل علی فضلی کے معاصر تھے۔''

(عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو حصہ دوم جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، ص ۱۴۰)

میر کمال الدین حسین اندرابی رسوا، جعفر زٹلی کے ہم عصروں میں سے ہیں۔ یہ کچھ دنوں تک اکبر شاہ کے دربار سے بھی وابستہ رہے۔ ان کی شاعری میں فارسی الفاظ کے ساتھ ساتھ قدیم دکنی الفاظ کی آمیزش بھی پائی جاتی ہے۔ ریاست جموں کشمیر کی شعرا میں میر کمال الدین حسین اندرابی کے بعد ہرگوپال خستہ کا نام سرفہرست ہے۔ یہ تبلی اور حالی کے ہم عصروں میں سے ہیں۔ ہرگوپال خستہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار سے وابستہ ہونے سے پہلے لاہور میں قیام پذیر تھے۔ وہاں پر بھی وہ کئی پرچوں سے وابستہ تھے۔ انہوں نے غزل، نظم، رباعی، قصیدہ اور مرثیہ لکھا۔ ان کی نظموں میں سب سے زیادہ مشہور نظم ''نرسنگھ اوتار'' ہے۔ یہ نظم مثنوی کے فارم میں لکھی گئی ہے جس میں اس دور کے سماجی اور سیاسی حالات کا

Scanned with CamScanner

احاطہ کیا گیا ہے۔ خستہ کے چھوٹے بھائی سالگرام سالک نے بھی نظم، مثنوی، غزل، قطعات اور تاریخوں کا ایک خاصہ ذخیرہ چھوڑا ہے، ان کی مثنوی ''سندر بدن'' کافی مشہور ہوئی۔ اس کے بعد ایک اہم نام محمد دین فوق کا ہے۔ ان کے تعلقات اس وقت کے بڑے شاعروں سے تھے جن میں ایک اہم نام علامہ اقبال کا ہے۔ انہوں نے غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی ''فوق'' کے عنوان سے ان کا مجموعہ کلام ہے۔

18 ویں صدی کے آخری شاعروں میں طالب کاشمیری، پنڈت نند لعل کول ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ نند لعل کے ممتاز ہونے کی ایک وجہ 'آئینۂ غالب' جیسی تنقیدی تصنیف ہے۔ یہ ابتدا میں دلبر تخلص رکھتے تھے۔ انہوں نے بارہ سال کی عمر میں شعر گوئی کا آغاز کیا۔ یہ اردو فارسی کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی خاصی قدرت رکھتے تھے۔ انہوں نے غزل گوئی سے آغاز کیا لیکن الگ الگ موضوعات پر نظمیں بھی کہی ہیں جس میں قومی، سیاسی، مذہبی موضوعات خاص ہیں۔ ''رشحات التخیل'' اور ''مرقع افکار'' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ جموں کشمیر کے بڑے شعرا میں رسا جاودانی کا نام بھی آتا ہے۔ رسا نے اپنے ذوق رسا کو اپنا رہنما بنایا اور اپنی خداداد صلاحیت کے سہارے کلام میں اس قدر پختگی آئی کہ ریاست کے بڑے بڑے شعرا میں ان کا شمار ہونے لگا۔ بنیادی طور پر تو رسا غزل کے شاعر ہیں لیکن انہوں نے رباعیات، گیت، مسدس، قطعات اور نظم میں بھی طبع آزمائی کی۔ ان کے دو مجموعے ''نظم ثریا'' اور ''لالہ صحرا'' شائع ہو چکے ہیں۔ رسا کے علاوہ غلام رسول نازکی ریاست کے شعرا میں ہیں۔ انہوں نے کشمیر کی پرسکون وادیوں میں آنکھ کھولی لیکن جب وہ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اس جنت نشاں کی بہاروں کی نذر کر چکے اور عمر کے آخری پڑاؤ پر پہنچے تو انہوں نے کشمیر کو جلتے ہوئے بھی دیکھا، یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں باطنی معنٰی کی کئی تہیں پوشیدہ ہیں۔ بظاہر ان کے اشعار پڑھ کر لگتا ہے کہ وہ دنیا کے مختلف مسائل پیش کر رہے ہیں لیکن کہیں نہ کہیں ان کے اشعار وادی میں پھیلے ہوئے کشت وخون کا المیہ ہے۔

Scanned with CamScanner

آج اس شہر پہ نازل ہے خداؤں کا عتاب
تو بھی اس شہر کا باسی ہے میرا ساتھ نہ چھوڑ
آسماں برسر پیکار ہے نظریں نہ چرا
یہ زمیں خون کی پیاسی ہے میرا ساتھ نہ چھوڑ

اردو ادب میں حامد کاشمیری کو ایک تنقید نگار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے لیکن ان کے اشعار کی دلکشی بھی قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ وادی کے دیگر شعرا کی طرح ان کے یہاں بھی کشمیر میں پھیلا انتشار نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنے اشعار میں انسانی اقدار کی زبوں حالی کی علامتی اور استعاراتی طور پر نشاندہی کی ہے۔

کوئی بستیوں میں نہ باقی رہا
فضاؤں میں خاموش نالے رہے
وحشت رفتار میں کوئی نہ کوئی بات تھی
سر پھرے خاموش جنگل راستہ دیتے رہے

فاروق نازکی نے کم لکھا مگر جو لکھا وہ معیار اور اعتبار سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ فاروقؔ کی شاعری وسیع تر انسانی نفسیات کی ترجمان ہے۔ انہوں نے غزلوں کے مقابلے نظمیں زیادہ کہیں۔ ان کی مشہور نظموں میں سے 'ہماری بات'، 'ایک خیال'، 'جنگل' زیادہ مشہور ہوئیں۔ انہوں نے پیچیدہ تراکیب کے بجائے آسان زبان کا استعمال کیا۔

اجالوں کے پجاری گا رہے ہیں
ہمارے گھر جلائے جا رہے ہیں
میں نے پوچھا تیری متاع حیات
بولا جہلم میں بہہ گیا سب کچھ

لہٰذا ریاست جموں کشمیر میں اردو شعرا اس وقت سے ملتے ہیں جب سے اردو شاعری کی

Scanned with CamScanner

رسائی دلّی دربار تک ہوتی ہے۔ زلّی کے معاصرین میں میر کمال الدین اندرابی ناجی کے معاصرین میں احسن اللہ خاں بیان اور سودا کے معاصرین میں محمد علی حشمت اور مظہر جان جاناں کے معاصرین میں محمد امین ،حافظ محمد حفیظ ،گنگا داس تسکین ،اجودھیا پرساد حیرت اقبال کے معاصرین میں منشی سراج الدین احمد خاں کا نام ملتا ہے۔

جموں کشمیر میں شاعری کے مقابلے فکشن کی شروعات کچھ تاخیر سے ہوتی ہے۔ یہاں اردو ناول کی ابتدا بیسویں صدی کے آغاز میں ہی ہوگئی تھی۔ اردو کے ابتدائی ناول نگاروں میں بعض لوگ پنڈت سالگرام سالگ اور مولوی محمد فوق کے نام لیتے ہیں لیکن سالگ کی داستان جگت روپ جسے ابتدائی ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے وہ دراصل ایک قصہ ہے جس کا حقیقی زندگی سے کوئی سروکار نہیں لیکن فوق نے اکبر اور انارکلی جیسے تاریخی قصے لکھ کر ناول نگاری کی طرف پیش قدمی ضرور کی تھی اگر چہ ابتدائی دور ہونے کے سبب اس میں ناول کے ان تمام فنی لوازمات کا التزام کم ہی ملتا ہے۔ ناول نگاری کو فروغ دینے میں ''رنبیر'' ہفت روزہ نے اہم کردار ادا کیا ہے جو کہ لالہ ملک صراف کی ادارت میں جموں سے شائع ہوتا تھا، اس میں ناول قسط وار چھپتے۔ یہ دور ریاست میں سماجی فلاح و بہبود کا دور تھا۔ بہت سی سماجی، مذہبی تنظیمیں اصلاحی مقاصد کے تحت کام کر رہی تھیں۔ وہیں ادیب اور مفکر بھی سماجی اور مذہبی روایتوں میں تبدیلی کے خواہاں تھے لہٰذا انہوں نے اصلاحی ادب کی تخلیق کا کام شروع کیا۔ اسی اصلاحی مقصد کے تحت شمبھو ناتھ ناظر نے ''ناظر کی اپیل'' کے عنوان سے ناول لکھا جس کے ذریعہ انہوں نے بیوہ کے درد کو بیان کیا اور بیوہ کی شادی پر زور دیا ہے۔ 25 اکتوبر 1924 کو ہفت روزہ 'رنبیر' میں اس کا تنقیدی جائزہ شائع ہوا۔ اس ناول کو سماجی سطح پر بہت پذیرائی ملی۔ 1924 میں موہن لال نے 'داستان محبت' کے عنوان سے ایک ناول لکھا۔ یہ دو عاشقوں کی محبت کی کہانی ہے جو دو الگ الگ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس دور کے لکھنے والوں میں پریم ناتھ پردیسی نے ''پوتی'' کے عنوان سے ناول لکھا لیکن یہ ناول نامساعد حالات کے تحت شائع نہ ہو سکا۔ پنڈت نند لال در بے غرض نے ''تازیانہ عبرت'' کے نام سے ناول لکھا۔ ریاست کے ناول نگاروں میں ایک بڑا نام رامانند ساگر کا

Scanned with CamScanner

ہے۔ان کا ناول ''اور انسان مر گیا'' ناول نگاری کی تاریخ میں ایک اہم باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ناول کا موضوع فرقہ وارانہ فسادات ہیں۔ ناول نگار نے اس میں فسادات کے نتیجے میں ہونے والی بربادیوں کے ساتھ ساتھ انسانی قدروں کی شکست وریخت کو نہایت ہی فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اس کی اہمیت برقرار ہے۔

ریاست جموں کشمیر میں اردو افسانہ کی بات کی جائے تو فوق نے بعض تاریخی اور نیم تاریخی قصے قلم بند کئے ہیں جس کو افسانے کے اولین نمونے کہہ سکتے ہیں، ان کے بعد چراغ حسرت ایک ایسی ادبی شخصیت ہیں جنھوں نے تاریخ، صحافت، ودینیات کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری میں بھی اپنا قلم آزمایا۔ان کے افسانوں کا مجموعہ 1927 میں ''کیلے کا چھلکا'' کے نام سے شائع ہوا۔اس کے علاوہ ''دنیا ہماری''، ''شام وسحر'' اور ''بہتے چراغ'' کے نام سے پریم ناتھ پردیسی کے بھی افسانوی مجموعے ملتے ہیں۔ان کے افسانے ڈوگرہ راج کے شخصی نظام کی قلعی کھولتے ہیں۔ 1947 سے پہلے ریاست میں اردو فکشن کا ایک بڑا نام کشمیری لال ذاکر کا بھی ہے۔انہوں نے 1943 میں اپنے افسانے ''الگ الگ راستے سے'' اردو فکشن میں قدم رکھا جو لاہور کے مایہ ناز رسالے ''ہمایوں'' سے شائع ہوا۔اس کے بعد ان کا افسانہ ''سندور کی راکھ'' منظر عام پر آیا جس کا موضوع شریک حیات کی وفات تھا۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 1968 میں ''جب کشمیر جل رہا تھا'' کے نام سے آیا۔ان کے تقریباً 29 نام اور 18 افسانوی مجموعے ہیں۔ انہوں نے تاریخی موضوعات، قومی یکجہتی، معصوم مزدور عورتوں کے مسائل، بوڑھوں کے مسائل، خشک سالی، بھوپال گیس المیہ، سنامی طوفان اور تقسیم ہند جیسے موضوعات پر لکھا۔

ریاست جموں کشمیر میں اردو زبان کے پھلنے پھولنے کے مواقع ابتدا سے ہی حاصل رہے اس کا ایک اہم سبب مسلمانوں کی بڑی تعداد کا ہونا تھا۔ مذہبی تعلیمی درس گاہوں میں بھی اردو پڑھائی جاتی تھی کیونکہ مذہبی تعلیمات کا ایک بڑا ذخیرہ اردو میں تھا لہٰذا حاکم وقت کے لئے سرکاری کاموں کو اردو زبان میں کرنا مجبوری ہوگئی۔

Scanned with CamScanner

لکھنوی عہد کے ممتاز شعرا: صفی لکھنوی اور ثاقب لکھنوی

ابتدا میں ہی واضح کر دینا ضروری ہے کہ منشی دوارکا پرساد افق ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۳ء میں انتقال فرمایا۔ صفی لکھنوی کا سن پیدائش ۱۸۶۲ء ہے اور انھوں نے افق سے طویل عمر پائی، ۱۹۵۰ء میں انتقال ہوا۔ اسی طرح ثاقب لکھنوی ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۶ء میں وفات پائی۔ اب ہم افق کے ہم عصر ان دونوں شاعروں پر یکے بعد دیگرے تبصرہ پیش کرتے ہیں۔ پہلے صفی لکھنوی۔

صفی لکھنوی کا ایک بہت مقبول خاص و عام شعر ہے۔

شاعری کیا ہے دلی جذبات کا اظہار ہے
دل اگر بے کار ہے تو شاعری بے کار ہے
(صفی لکھنوی)

یوں تو اس شعر کا تمام استعمال ہوا ہے لیکن پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب نے اپنی کتاب ''ہماری شاعری'' میں اس شعر کا بڑا ہی معقول استعمال کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''بعض لوگ شعر کو بے کار چیز اور شاعری کو بے کاری کا مشغلہ کہتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ وہ شعر و شاعری کا کیا مفہوم سمجھتے ہیں۔ صفی لکھنوی نے ان نافہموں کو ایک نہایت مختصر اور جامع جواب دیا ہے۔ فرماتے ہیں

شاعری کیا ہے؟ دلی جذبات کا اظہار ہے
دل اگر بے کار ہے تو شاعری بے کار ہے
(صفی لکھنوی)

(''ہماری شاعری'' از پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ ص ۹۱-۰۲)

صفی کا نام علی نقی تھا۔ شاعری کے سلسلے میں انھوں نے تخلص صفی اختیار کیا۔ صفی کی مقبولیت

ڈاکٹر احسان حسن، جواہر گنج، دھرا ہریا، الہ آباد

Scanned with CamScanner

میں ان کی قومی نظموں کا بڑا ہاتھ ہے۔ دراصل صفؔی کا عہد پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد کا ہے اور انھوں نے تقریباً ۱۸۸۰ء کے آس پاس سے شاعری شروع کی۔ یہ وہ دور تھا جب ملک میں حب الوطنی کی لہر پروان چڑھ رہی تھی اور عوام کے دلوں میں بغاوت کے جذبات ابل رہے تھے۔ ایسے میں وہ صفؔی کی شاعری میں قومی اور ملکی عناصر نہ صرف وقت و حالات کا تقاضا تھے بلکہ ایک فن کار کا فرض بھی۔ یہی وہ دور تھا جب سرسید قوم کی فکر میں ڈوبے ہوئے تھے اور طرح طرح سے ترقی و خوشحالی کے راستے تلاش کر رہے تھے تاکہ آنے والی نسلوں کو تاریکی سے بچایا جا سکے اور انھیں ایک روشن مستقبل حاصل ہو۔

نواسیرانِ چمن کے کوئی دل سے پوچھے
وہ مصیبت جو شکستہ پر پرواز میں ہے
تو بھی مایوسِ تمنا مرے انداز میں ہے
جب تو یہ درد چھپے تری آواز میں ہے

(صفؔی لکھنوی)

صفؔی لکھنوی کی زبان میں سادگی اور بیان میں ایک فطری صفائی ملتی ہے۔ انھوں نے اپنے دور میں رائج لکھنوی زبان کو اپنے انداز سے استعمال کیا ہے۔ کلام کی پختگی اور مشاقی کے ساتھ ساتھ اس کی تازگی اور ندرت نمایاں وصف ہوتے ہیں۔ صفؔی کی ایک بہت مشہور نظم ''تنظیم الحیات'' ہے۔ یہ ایک طویل نظم ہے اور انگریزی کی ایک کتاب کا منظوم ترجمہ ہے۔ گو صفؔی نے اپنی نظم ''تنظیم الحیات'' کا بنیادی خیال تو انگریزی کتاب سے لیا ہی ساتھ ہی نظم تخلیق کرنے کی تحریک بھی انگریزی کتاب سے ہی ملی۔ دراصل اس دور میں اس قسم کی ادبی سرگرمیاں پروان چڑھ رہی تھیں۔ سرسید نے ''سائنٹفک سوسائٹی'' قائم کی تھی اور انگریزی اردو زبانوں میں فکر و خیال کی آمد و رفت کو تقویت مل رہی تھی۔ صفؔی کی تخلیق ''تنظیم الحیات'' کا اصل ماخذ چینی زبان کی کتاب ہے۔ چینی سے انگریزی میں ترجمہ ہوا اور پھر انگریزی کتاب کو سامنے رکھ کر صفؔی نے ''تنظیم الحیات'' لکھی۔ اس کی تمہید میں صفؔی کا بیان ہے کہ اب خدا کی ہستی ایک نقطۂ موہوم رہ گئی ہے اور انسان مذہب و اخلاق

Scanned with CamScanner

سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایسے وقت میں تنظیم حیات کی سخت ضرورت اور اہمیت محسوس ہوتی ہے، اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے نظم ''تنظیم الحیات'' لکھی گئی۔

صفؔی نے ہندوستان کے مختلف مشہور شہروں پر نظمیں لکھی ہیں جن میں بمبئی اور الہ آباد پر ان کی نظمیں خاص طور پر مشہور ہیں۔ ان نظموں میں ہندوستان کی عظمت، حب الوطنی اور قوم پرستی کے جذبات نمایاں ہیں، ساتھ ہی ساتھ نئے رجحانات و میلانات کی ترجمانی کرتے ہوئے صفؔی نے آئندہ ادب کی آہٹ بھی دی ہے۔ بمبئی پر ان کا شعر ملاحظہ ہو۔

ہر دو جانب کوہساروں کا تسلسل تا بہ دور
اور ان کے بیچ میں تو صورتِ بین السطور

(صفؔی لکھنوی)

صفؔی کی منظر کشی بہت عمدہ ہوتی ہے۔ مناظرِ فطرت پر انھوں نے متعدد نظمیں تخلیق کی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ستارے ہیں کہ نازک آبگینے
رواں یا بحر اخضر میں سفینے
ٹنکے ہیں پردۂ شب میں ستارے
نشاط انگیز ہیں دلکش نظارے

(صفؔی لکھنوی)

صفؔی دبستانِ لکھنؤ کے ایک اہم شاعر ہیں، روایتی شاعری اور محض حسن و عشق تک محدود رہنے والے ادب کو ارتقاء دینے اور زندگی کے مختلف موضوعات سے شعر و ادب کا رشتہ قائم کرنے والوں میں صفؔی کا بھی اپنا ایک مقام ہے۔ انھوں نے لکھنوی زبان اور انداز کے شبنمی احساس کو مجروح کئے بغیر اپنی شاعری کو موضوعاتی وسعت دی، حوصلہ مندی کی طرف گامزن کیا اور ادب کو وقت و حالات کے تقاضوں کا ترجمان بنایا۔ صفؔی نے نظموں کے علاوہ غزلیں بھی خوب کہی ہیں۔

Scanned with CamScanner

ان کی غزلوں کے عشقیہ مضامین میں بھی ایک متانت اور معیار موجود ہے۔ کہیں بھی سطحیت اور عامیانہ پن نظر نہیں آتا۔ صفؔی کی غزلوں کا مجموعہ ''صحیفۃ الغزل'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ غزل کا ایک بہت مقبول شعر ملاحظہ ہو؛

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

(صفؔی لکھنوی)

اب ہم منشی دوارکا پرساد افقؔ کے دوسرے ہم عصر شاعر ثاقبؔ لکھنوی پر تبصرہ پیش کرتے ہیں۔ ثاقبؔ کا نام مرزا ذاکر حسین تھا۔ انھوں نے اپنے دیوان کے دیباچہ میں ''عرضِ حال'' کے عنوان سے کچھ یوں لکھا ہے۔

''چھپن سال شاعری کی خدمت کی، اس طویل مدت میں یہ کوشش رہی کہ زبان میرؔ کی سی اور تخیل غالبؔ کا سا ہو۔ معلوم نہیں یہ سعی مشکور ہوئی یا غیر مشکور۔ اپنا عیب بھی محبوب ہوتا ہے لہٰذا یہ میرے سمجھنے کی بات نہیں۔ البتہ حسن ظن رکھنے والے احباب مجھ کو میرؔ و غالبؔ کا صحیح پیرو خیال کرتے ہیں۔''

(بحوالہ ''لکھنؤ کا دبستانِ شاعری'' از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، جلد دوم، ص ۵۴۴)

ثاقبؔ کی شاعری کے متعلق پروفیسر نورالحسن نقوی لکھتے ہیں؛

''ثاقبؔ نے متعدد اصناف میں طبع آزمائی کی مگر ان کی شہرت کا مدار غزل پر ہے۔ انھوں نے اساتذہ کی پیروی کی ہے۔ دیوان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کلامِ غالبؔ بطور خاص ان کے پیش نظر ہے۔ غزل کے دیگر شعراء کی طرح عشقیہ مضامین نے نمایاں طور پر ان کے کلام میں جگہ پائی ہے مگر اعتدال و توازن کو ہر جگہ برقرار رکھا ہے۔ پرگوئی اور زود گوئی سے ان کے شاعرانہ رتبے کو نقصان پہنچا ہے۔''

Scanned with CamScanner

(تاریخِ ادب اردو'' از پروفیسر نورالحسن نقوی، ص ۵۷۱)

اس سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ ثاقبؔ نے اساتذہ کی پیروی کر کے اور وہ بھی بالخصوص میرؔ و غالبؔ جو دہلی دبستان کے شاعر ہیں، خود کو دبستانِ لکھنؤ سے کافی حد تک منحرف کر لیا۔ ثاقبؔ نے غالبؔ ہی کی طرح عام اور رسمی عشقیہ مضامین سے پرہیز کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں اکثر ایک صوفیانہ سنجیدگی اور خلوص نظر آتا ہے۔ چونکہ عشقیہ مضامین میں تصوف کی آمیزش سے خواہ رسمی طور پر ہی سہی غزل میں عموماً سنجیدگی پیدا ہو جاتی ہے اور عشق و ہوس کی تفریق برقرار رہتی ہے، لہٰذا ثاقبؔ کی شاعری کے اس انداز نے لکھنوی شعراء کے یہاں جو کمی عام تھی اس کو دور کیا۔

جہاں میں قلب ذلت کش کی بھی اک شان ہوتی ہے
شب فرقت بس اک میرے ہی گھر مہمان ہوتی ہے

(ثاقبؔ لکھنوی)

ثاقبؔ کی شاعری کا دوسرا پہلو میرؔ سے ان کی عقیدت کا ہے۔ اس کی ایک مثال یوں ہے کہ اہلِ لکھنؤ نے ''آئے ہے، جائے ہے'' کو ثاقبؔ سے بہت پہلے ہی متروک کر دیا تھا اور ثاقبؔ کے زمانے میں اس قسم کی زبان کا کوئی چلن باقی نہ تھا لیکن ثاقبؔ کو ریختی کے اس انداز میں ایسی دلکشی نظر آئی کہ پوری ایک غزل اسی ردیف قافیہ میں کہہ ڈالی۔

اس کے در سے روک کر مجھ کو کوئی کیا پائے ہے
نامرادوں کو بھی اک دن مدعا مل جائے ہے
لاکھ میں اس کو سنبھالوں پھر بھی تڑپا جائے ہے
کیا کہوں اس سے دل ایسوں کو کوئی بہلائے ہے

(ثاقبؔ لکھنوی)

ثاقبؔ کے کلام میں بے شمار ایسے اشعار ملتے ہیں جن پر میرؔ کی شاعری کا گمان ہوتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

Scanned with CamScanner

بہت سی عمر مٹا کر جسے بنایا تھا
مکاں وہ جل گیا تھوڑی سی روشنی کے لئے
وہی رات میری وہی رات ان کی
کہیں بڑھ گئی ہے کہیں گھٹ گئی ہے
(ثاقبؔ لکھنوی)

اور ثاقبؔ کا یہ شعر آج محاورے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے
(ثاقبؔ لکھنوی)

اس طرح ثاقبؔ نے لکھنؤ میں رہتے ہوئے دبستانِ دہلی کی تقلید کی اور لکھنوی شاعری کے مزاج سے انحراف کیا۔ یہ کام مشکل تھا اس کے لئے عقیدت اور جنون کی ضرورت ہوتی ہے۔ ثاقبؔ کو میرؔ و غالبؔ سے عقیدت تھی اور انھوں نے ان دونوں بڑے شاعروں کی تقلید کرتے ہوئے عمر بھر شاعری کی۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ کے شعراء میں آج ثاقبؔ کا کلام اپنے منفرد رنگ و آہنگ اور غالبؔ و میرؔ کے لمس کے لئے پہچانا جاتا ہے۔

کتابیات:

''لکھنؤ کا دبستانِ شاعری'' از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
''قدیم لکھنؤ کی آخری بہار'' از مرزا جعفر حسین
''بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں'' از مرزا جعفر حسین
''تاریخ ادب اردو'' از پروفیسر نورالحسن نقوی
''ہماری شاعری'' از سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ
''آج کا اردو ادب'' از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
''اردو ادب کی تنقیدی تاریخ''، از سید احتشام حسین

Scanned with CamScanner

فنِ داستان پر ایک نظر

داستان کی ابتدائی شکل ہمیں عہد قدیم کی قصہ گوئی میں ملتی ہے۔ جب انسان نے پہلے پہل حیوانی زندگی چھوڑ کر مہذب زندگی کی طرف قدم بڑھایا اور پہلے پہل بولنا سیکھا تو اپنے روزمرہ کے تجربات کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ شریک کرنے کیلئے اس نے رفتہ رفتہ ایک زبان کی تشکیل کر لی ہوگی۔ تہذیب کے ابتدائی دور میں انسان نے چھوٹے چھوٹے قبیلے بنا کر رہنا شروع کیا، شکار کرنا، کھانا، تفریح کرنا اور جنگلی جانوروں سے اپنی حفاظت کرنا انکے اہم مشاغل تھے۔ قیاس ہے کہ ان کے فرصت کے اوقات ان کے مہم آمیز شکاری قصوں سے مزین ہوتے ہوں گے۔ ان قصوں نے رفتہ رفتہ اپنے سننے والوں پر گرفت مضبوط کی ہوگی اور لوگوں کی توجہ اپنی طرف مرکوز رکھنے کے لئے قصہ گو اس میں دلچسپی کے عناصر پیدا کرنے لگے ہوں گے۔ اسی دلچسپی کے عنصر نے قصوں کو حقیقت سے دور کر کے ایک خیالی دنیا میں پہنچا دیا ہوگا اور اب یہ قصے غیر معمولی انسانی تخیل کی اختراع ہونے لگے اور اس طرح تہذیب کا یہی ارتقائی عہد فن قصہ گوئی کے ارتقا میں معاون ہوا۔ خود حفاظتی، ضعیف الاعتقادی، جنگ، توہم پرستی، عشق اور جنسی جذبات قدیم انسانی زندگی کے خاص جزو تھے۔ اس لئے ابتدا میں یہ قصے سحر، بھوت پریت، لڑائی اور جنسی رجحانات پر ہی مبنی ہوتے ہوں گے۔ دھیرے دھیرے قصہ گوئی انسانی زندگی کا اہم جزو بن کر زینہ بزینہ ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہونے لگے۔ آج بھی بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے اپنے بچپن میں اپنی نانی یا دادی سے ایسے قصے نہ سنے ہوں جو انہوں نے بھی اپنے بچپن میں اپنی نانی دادی سے سن کر اپنی یادداشت کے خزانے میں محفوظ کر لئے تھے۔ اور اس طرح زبانی قصوں کا ایک سلسلہ ہے جس پر محض قیاس آرائی ہی کی جا سکتی ہے لیکن جب زبان نے تحریری شکل اختیار کر لی اور انسان نے لکھنے کا فن ایجاد کر لیا تو انہیں قصوں کو لکھا جانے لگا اور قصہ نویس اپنے غیر معمولی تخیل کی جولانیاں دکھانے لگا تو طوالت نے اسے داستان نویسی کی شکل دے دی۔ پہلے تحریری قصہ کا سراغ

مسز ناصحہ عثمانی، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج، الہ آباد

Scanned with CamScanner

قدیم مصر میں ملتا ہے۔ مصر کی تہذیب دنیا کی قدیم ترین تہذیب ہے وہاں تحریر کا فن تقریباً چار ہزار سال قبل مسیح دریافت کرلیا گیا تھا فضل حق قریشی کے مطابق دنیا کا سب سے پہلا افسانہ شاہ فاخری (۴۸۰۰ قبل مسیح) کے عہد کا ہے اس کا مسودہ ۳۴۰۶ء قبل مسیح کا ہے۔ تین ہزار سے دو ہزار قبل مسیح میں گل گاش کی داستان کئی رزمیہ نظموں میں بیان کی گئی ہیں۔[۱]

جناب سبط حسن نے گل گاش کی مکمل داستان دسمبر ۱۹۶۱ء سے مئی ۱۹۶۲ء کے نقوش لاہور میں شائع کرائی ہے۔ مصر میں ۲۳۰۰ قبل مسیح میں کشتی شکستہ ملاح [۲] کی کہانی لکھی گئی اس عہد کا دوسرا نیم تاریخی قصہ سنوہا کا ہے۔ بارھویں تیرھویں صدی میں مصر میں لاتعداد کہانیاں ملتی ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری ۱۴۰۰ قبل مسیح کے ایک افسانے کو قدیم ترین کہتے ہیں۔[۳] فلسطین اور اسکے نواح میں بھی ۱۰۰۰ قبل مسیح سے پہلے قصے لکھے جانے لگے تھے۔ اس کے علاوہ سبھی مذاہب کی مقدس کتابوں میں بھی قصوں کے لاتعداد نمونے ملتے ہیں۔

ہندوستانی تہذیب بھی کافی قدیم تہذیب ہے دوسری روایتوں کی طرح قصہ گوئی کی روایت بھی یہاں عہد قدیم سے ہی نظر آتی ہے، وید، اپنشد، مہابھارت، گیتا وغیرہ میں لاتعداد چھوٹے چھوٹے قصے شامل ہیں۔ پروفیسر ونٹرنٹز [۴] کے مطابق ویدک ادب ڈھائی اور دو ہزار قبل مسیح میں شروع ہوکر ۱۰۰۰ قبل مسیح میں مکمل ہو جاتا ہے اور اس سے ہندوستان میں داستانوی ادب کی عمر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ دوسری زبانوں کی طرح ہندوستان میں بھی قدیم افسانوی ادب کی دو روایتیں ملتی ہیں جن میں ایک طرف تو رومانوی حکایتیں ہیں دوسری طرف عشقیہ رومان، پنچ تنتر، بودھ جاتک، پورانک کتھائیں وغیرہ ہندوستان کے قدیم افسانوی ادب کے بہترین نمونے ہیں اور آج تک مقبول ہیں۔ یہ قصہ گوئی کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں ان کا ایک لمبا سلسلہ ہے اور جیسا کہ ابتدا میں لکھا جاچکا ہے یہی قصے داستانوی ادب کے ارتقا میں معاون ہوئے۔

کس کے افسانوی ادب کو داستان کہنا چاہئے؟ اور کون سی ایسی بات ہے جو داستان کو قدیم حکایتوں اور رومانی قصوں سے الگ کرتی ہے؟ کلیم الدین احمد کا قول ہے :

Scanned with CamScanner

''داستان کہانی کی طویل پیچیدہ اور بھاری بھرکم صورت ہے ۵''

شمس الرحمٰن فاروقی کا قول ہے :

''داستان ایسا بیانیہ ہے جو زبانی سنانے کے لیے تصنیف کیا جائے، چاہے فی البدیہہ، چاہے سوچ سوچ کر، خواہ دن رات کی محنت سے لکھ کر یا دل میں گھڑ کر، زبانی یاد کر کے صرف سنانے کے لیے یا چھپوانے اور سنانے کے لیے یعنی طریقۂ تصنیف و تشکیل جو بھی ہو، لیکن مقصد یہی ہوتا ہے کے اس بیانیہ کو زبانی سنایا جائے گا'' ۶

داستان کے فن پر کافی تبصرہ کرنے کے بعد پروفیسر گیان چند جس نتیجہ پر پہونچتے ہیں اسے مختصراً نقل کر دینا مناسب ہے۔

''معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کوئی رشتہ نہیں جو تمام داستانوں کو منسلک کرتا ہو ان میں یک رنگی نہیں بوقلمونی ہے۔ پھر بھی ہم داستانوں کو حکایتوں یا جدید ناولوں سے الگ شناخت کر سکتے ہیں یعنی ہمارے ذہن کے کسی گوشے میں اس صنف کے خدوخال کا کوئی نہ کوئی شعور یقیناً موجود ہے مغرب میں داستانوں کو رومانس کہا جاتا ہے یہ کلیدی لفظ ہی داستانوں کی کماحقہ نشاندہی کرتا ہے، داستان ہمیشہ رومانی اور غیر اصلی ہوتی ہے.....رومانی داستانوں میں ایک خیالی دنیا خیالی واقعات کا بیان ہوتا ہے اس پر تخیل کا رنگین قرمزی بادل چھایا رہتا ہے اس میں کوئی فوق فطری مخلوق نہ بھی ہو تو تب بھی اس میں جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں وہ حقیقی سے زیادہ تخیلی ہوتے ہیں فوق الفطرت کی تحیّر خیزی حسن و عشق کی رنگینی، مہمات کی پیچیدگی لطفِ بیان انہیں عناصر سے داستان عبارت ہے ایک دل کو اٹکا لینے

Scanned with CamScanner

والی کیفیت اور اسکے بعد ایک فرحت و آسودگی کا احساس داستان اور
داستان گو کا تحفہ ہے۔" ے

اس اقتباس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ مغربی رومان اور داستان ایک ہی چیز ہے لیکن کیونکہ ابتدا میں اردو والے مغربی ادب سے نا آشنا تھے اسلئے دیگر ابتدائی اردو اصناف کی طرح داستانوں نے بھی قدیم مغربی رومان سے کوئی اثر نہیں لیا بلکہ عربی، فارسی اور ہندوستانی ادب اسے متاثر کرتے رہے۔ ان داستانوں میں رومانی فضا کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اردو ادب ابتدا سے ہی رومان پرور رہا چنانچہ اردو شاعری کا آغاز غزلوں کی رومان پرور فضا سے ہوا تو مثنوی میں عشق و عاشقی کی داستانیں نظم ہوئیں اور دوسری اصناف میں بھی کسی نہ کسی شکل میں رومانیت کو برقرار رکھا گیا۔ ایسے میں جب نثر کا آغاز ہوا تو انہیں جانوروں کی ناصحانہ حکایتوں سے زیادہ رومانی کہانیوں کی فضا راس آئی۔ انہوں نے داستان کی طرف قدم بڑھایا اور نثر میں شاعری کرنے لگے۔ اس وقت تک سنسکرت اور دوسری ہندوستانی زبانوں میں لاتعداد مختصر اور طویل داستانیں لکھی جاچکی تھیں۔ گناڈھیہ کی برہت کتھا کے ترجمے سوم دیو کی کتھا سرت ساگر (۱۰۸۱ء۔۱۰۶۳ء) شک سپتتی (جو طوطا کہانی کی اصل ہے) لکھی جاچکی تھی ان میں فطری اور فوق فطری ہر طرح کی کہانیاں ہیں بارھویں صدی سے چودھویں صدی کے درمیان بیتال پچیسی اور سنگھاسن بتیسی لکھی گئی۔ یہ سبھی کہانیاں مافوق الفطری قصوں کو بنیاد بناکر لکھی گئیں ہیں اور مختلف کہانیوں کو ایک بنیادی کہانی کے ذریعہ جوڑ دیا گیا ہے ان قصوں کے علاوہ سنسکرت میں بڑے بڑے نثری رومان بھی کثیر تعداد میں لکھے گئے۔ جن کا پلاٹ بیشتر مافوق الفطری عناصر پر مشتمل ہوتا تھا نادیدہ عشق اور ایک نظر کا عشق تقریباً ہر قصہ کی بنیاد ہوتی تھی جو کہانی کے ارتقا میں مدد کرتی تھی ان قصوں کے ہیرو ہیروئن راج کمار راج کماری ہوتے تھے اور عشق کے ہاتھوں مجبور ہوکر طرح طرح کے مصائب برداشت کرتے اور اپنا عیش و عشرت چھوڑ کر مسافرت کی زندگی اختیار کرتے والدین کی دل شکنی کرتے بلکہ اکثر ان سے بغاوت کرتے ہیں اور جب تکمیلِ آرزو تک پہنچتے تو

Scanned with CamScanner

کوئی غیر متوقع واقعہ ظہور پذیر ہوتا ملے ہوئے پھر بچھڑ جاتے اور نئے سرے سے مصائب کا آغاز ہوتا پھر کوئی مافوق الفطری کردار دیو جن یا پری ان کی مدد کرتا غیب سے کوئی کرشمہ ہوتا اور کہانی کا طربیہ خاتمہ ہو جاتا۔ اردو میں بھی اسی طرح کے مرکزی پلاٹ کی داستانیں موجود ہیں اور ان داستانوں پر شعوری یا غیر شعوری طور پر ان ہندوستانی کہانیوں کا اثر ضرور پڑا ہوگا۔

ہندوستانی کہانیوں کے علاوہ عربی اور فارسی داستانوں سے اردو داستانوں نے براہِ راست اثر لیا۔ عرب میں ایام جاہلیت میں ادب کے فروغ کے بہت مواقع فراہم تھے ایک طرف تو شعر و شاعری کا بول بالا تھا قصیدہ گوئی کو خاص مقبولیت حاصل تھی دوسری طرف داستان گوئی کا فن ترقی کر رہا تھا۔ روایت ہے کہ داستان گوئی زوال آمادہ سماجی نظام کا شوق ہوتا ہے جب لوگ عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں انہیں کوئی کام نہیں ہوتا تو وہ داستان گوئی کو سامانِ عیش سمجھتے ہیں اور اپنے فرصت کے اوقات داستان سن کر بسر کر لیتے ہیں۔ عرب کے دور جاہلیت کا ماحول بھی کچھ ایسا ہی تھا رات کو لوگ ریت پر اکٹھا ہو جاتے اور قصے سناتے، عہدِ اسلام میں خلفائے عباسیہ کے عہد میں داستان گوئی بہت مقبول ہوئی۔ عربی کے مشہور قصوں میں الف لیلہ ولیلہ، مآنہ لیلہ، الفرج، بعد الشدّہ وغیرہ ہیں ۸

فارسی قصوں سے اردو نے سب سے زیادہ اثر لیا اکثر اردو داستانیں فارسی قصوں کا ترجمہ ہیں۔ ایرانیوں کا تخیل فوق الفطری فضا میں بہت بلند پروازی کرتا ہے۔ حالانکہ زیادہ تر مشہور فارسی داستانیں ہندوستان میں ہی تصنیف ہوئیں۔ مشہور زمانہ منظوم داستان شاہ نامہ اور منثور داستان امیر حمزہ ہندوستان میں ہی تصنیف ہوئیں۔ شاہنامہ میں اکثر مافوق الفطری کردار وواقعات ہیں۔ عربی داستان ''الفرج'' اور ''بعد الشہدّۃ'' کا بھی فارسی میں ترجمہ ہو چکا ہے 'پنج تنتر' کا سب سے مشہور ترجمہ ایران میں نظامی گنجوی نے پنج گنج یا کلیلہ ودمنہ کے نام سے کیا اس کے علاوہ گلستان، اخلاق محسنی بہارستان وغیرہ مختصر حکایتوں کے مجموعے ہیں۔ سترھویں صدی میں اصفہان کے ایک درویش نے 'ہزار و یک روز' لکھا۔ ان کے علاوہ ہفت سیر حاتم، گل بکاؤلی،

Scanned with CamScanner

قصہ چہار درویش، بوستان خیال، گل وصنوبر وغیرہ داستانیں اپنے زمانے کی مشہور داستانیں ہیں جن سے اردو والوں نے براہِ راست استفادہ کیا۔ ان سبھی داستانوں میں قصوں کا مرکزی خیال مافوق الفطری عناصر کے گرد چکر کاٹتا ہے۔ سبھی داستانوں میں شر پر خیر کو فتح ملتی ہے برائی کا انجام برا ہوتا ہے کہانی کا ہیرو ہمیشہ نیک اور خیر کا مجسمہ ہوتا ہے اس میں غیر معمولی طاقت ہوتی ہے وہ بڑی سے بڑی طاقت کو زیر کر دیتا ہے یہاں تک کہ دیو اور جن وغیرہ پر بھی ان کو فتح حاصل ہوتی ہے ان سبھی میں کرداروں کا کوئی تدریجی ارتقا نہیں ہوتا جو برا ہے وہ شروع سے آخری تک برا ہے جو اچھا ہے وہ ہمیشہ اچھا ہے اور کسی قیمت پر کوئی غلط کام نہیں کر سکتا ہر فن میں ماہر ہوتا ہے۔ فارسی اور سنسکرت قصوں میں ایک فرق یہ ہے کہ سنسکرت قصے جہاں عوامی زندگی اور عام جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں وہیں فارسی قصے کیونکہ رؤسا اور بادشاہوں کے شغل ہوا کرتے تھے اس لئے یہ عام انسان اور عوامی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔

پروفیسر گیان چند کا قول ہے ''داستان سنانے کا فن ہے لکھنے کا نہیں'' یعنی داستان کا داستان گوئی سے وہی رشتہ ہے جو ڈرامے کا اسٹیج سے اس لئے جس طرح ڈراما لکھتے وقت اسٹیج کی پابندیوں اور ضروریات کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے اسی طرح داستان لکھتے وقت سامعین کے مذاق کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے اس لئے داستان کو صرف ایک تصنیف کی حیثیت سے نہیں دیکھ سکتے بلکہ داستان گوئی کے لوازمات کے نقطہ نظر سے اس میں دلچسپی کے عناصر کا ہونا بھی ضروری ہے۔ لہٰذا اس فن کی ابتدا ہی سنائے جانے کے غرض سے ہوئی اور داستان گوئی بذات خود ایک فن بن گیا۔ آج اس فن کا کوئی پرسان حال نہیں اس کے باوجود داستان گوئی کا ذکر آتے ہی سبھی اردو داں حضرات کی زبان پر میر باقر علی داستان گو کا نام آجاتا ہے یہ قبول عام اس وقت داستان گوئی کے فن کی اہمیت کی دلیل ہے اس دور میں جب کہ ہر ایک دربار اور ہر امیر ایک داستان گو باقاعدہ اپنی خدمت کے لیے مامور کرتا تھا کسی مخصوص داستان گو کو ایسا نام حاصل ہو جانا اس کے فنی معراج کا ثبوت ہے اور ساتھ ہی ساتھ داستان گوئی کی مقبولیت کی دلیل بھی۔

Scanned with CamScanner

زمانۂ جاہلیت میں عرب میں قصہ گوئی کا رواج بہت عام تھا سامر (داستان گو) شام کے کھانے کے بعد چاندنی راتوں میں بڑے دل فریب انداز میں داستان بیان کرتا اور لوگ ریت پر بیٹھ کر سنتے اور داستان ختم ہونے پر اجرت میں اسے کھجوروں کا ایک حصہ دیا جاتا۔ ۹ شہناز انجم نے اپنی تصنیف 'ادبی نثر کا ارتقا' میں عبدالقادر سروری کا دنیائے افسانہ سے ایک حوالہ پیش کیا ہے جس میں عربی روایت کا ذکر ملتا ہے۔

> '' داستان گوئی قدیم ہے عربوں اور ایرانیوں کے یہاں بھی اسکا رواج تھا۔ عرب داستان کو سمر کہتے تھے اور داستان گو سامر کہلاتے تھے کیوں کہ چاندنی راتوں میں لوگ جمع ہو کر قصے اور داستانیں کہا کرتے تھے..... یہ فن ایرانیوں کے ذریعہ ہند میں پہونچا اور محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں اس کی ترقی عروج و کمال کو پہنچ گئی'' ۱۰

ہندوستان میں داستان گوئی کا رواج سب سے زیادہ لکھنؤ، دلی، رام پور اور حیدرآباد میں ہوا میر باقر علی داستان گو کے نانا امیر علی قلعے میں قصے سناتے تھے باقر علی کے ماموں کاظم علی نے اس فن میں لکھنؤ اور حیدرآباد کے داستان گویوں سے بھی زیادہ ترقی کی۔ رام پور میں داستان گویوں کو بہت عزت ملی اور بہت سے داستان گو رامپور چلے گئے لکھنؤ سے حکیم اصغر علی اور میر نواب رامپور چلے گئے۔ لکھنؤ میں مرزا طور اور بڑے منشی میر فدا علی مشہور داستان گو تھے، اس دور میں داستان گوئی کی اہمیت کا اس سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب میں نے داستان، طلسم ہوشربا، کی جلدیں تلاش کرنی شروع کی تو ایک صاحب جن کا تعلق کم تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا انہوں نے بتایا کہ انکے پاس ہے یہی نہیں انہوں نے 'طلسم ہفت پیکر کی' کی ایک جلد مجھے لاکر دی یہ بھی معلوم ہوا کہ انکے دادا داستان گو تھے جو دائرہ شاہ اجمل کے پھاٹک پر داستان سنایا کرتے تھے۔

داستانیں ایک طرف تو داستان گو کے لیے ذریعۂ معاش بن گئیں دوسری طرف امرا ورؤسا کے لئے راہ فرار۔ جب انسان اپنی حقیقی زندگی میں بے عمل اور بے بس ہو جاتا ہے تو وہ ایک

Scanned with CamScanner

طرح کی فرار کی راہ تلاش کرتا ہے جہاں وہ وقتی طور پر ہی سہی تلخ حقائق کو فراموش کر سکے۔ ہندی ادب میں بھکتی کال اسی راہ فرار کی شکل ہے جب کہ ہندوستان پر مسلمانوں کا تسلط ہو گیا تھا ہندوستانی حکمراں چھوٹی چھوٹی باتوں میں آپس میں ہی لڑتے رہتے تھے اور عوام وخواص میں بے عملی کی حکومت تھی ایسے میں کویوں نے تصوف کی گود میں پناہ لی اور اس مادی دنیا سے رشتہ توڑ لیا مسلمانوں میں یہ صورت حال انگریزوں کے تسلط کے بعد ظاہر ہونے لگی تھی ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہندوستان پر باضابطہ حکومت ہونے کے بعد ہندوستانی بادشاہ ونواب انگریزوں کے ہاتھ کی کٹھپتلیاں بن کر رہ گئے تھے۔ سیاسی حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ ہندوستانی عوام کے قویٰ مضمحل ہو چکے تھے وہ کسی طرح کا عملی نمونہ تو پیش نہیں کر سکتے تھے۔ ترقی کی راہ میں وہ انگریزوں سے بہت پیچھے تھے اس لئے انگریزوں سے نبرد آزماں بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ ایسے میں اگر ان کو ہر طرح کی دنیاوی دولت میسر بھی آجاتی تو بھی دماغی سکون نہیں حاصل کر سکتے تھے۔ دل مضطرب لیکن کچھ کرنے کی اہلیت کا فقدان ایسے میں دل بہلانے کے لئے داستان کی فضا بہت سازگار ثابت ہوئی جو کچھ عملی دنیا میں نہیں کر سکتے تھے وہ داستانوں میں بآسانی کر لیتے تھے۔ بقول آغا سہیل :

> ''۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی نے ادبا کے ایک طبقہ کو جو راہ سجھائی وہ سحر اور طلسمات کی خیالی قوتوں کی راہ تھی۔ عوام الناس کے اذھان کی آسودگی انہیں طلسمات میں تھی کیوں کہ یہ طلسمات بہت سے مہمات کی کنجی تھے اور تمام تر امیدوں کے مرکز تھے.....
> اسکی وجہ یہی ہے کہ معاشرے کو جتنی شدت سے اپنی ہزیمت کا احساس ہے اتنی ہی شدت سے اس کا انتقامی جذبہ ابل رہا ہے اور سحر وطلسمات کے ذریعہ حریف پر قابو پا کر تسکین حاصل کر رہا ہے''۔ ۱۱

داستان گوئی ایک طرف تو نفسیاتی تسکین کا باعث تھی دوسری طرف غم روزگار سے فرار۔

Scanned with CamScanner

رات کے وقت داستان گو پر لطف انداز بیان میں داستان گوئی کا آغاز کرتا اور سامعین اپنے سارے مصائب بھول کر ہمہ تن گوش ہو جاتے نارنج وترنج چلتے اور جب ہیرو کوئی فتح حاصل کرتا تو گویا انہیں فتح حاصل ہوتی۔ داستان گو ایک ایک افسانوی موڑ پر سامعین کے ذوق کا لحاظ رکھتا اور مستقل سامعین کی توجہ کو اپنی طرف مرکوز رکھتا۔ گذشتہ لکھنؤ میں عبدالحلیم شرر محفل داستان کا نقشہ یوں پیش کرتے ہیں:

> ''لکھنؤ سے بڑھ کر داستان گوئی کا چرچا اور کہیں کم ہوگا بیس پچیس یاران صادق اور دوستان موافق شب کے وقت کے پردہ دار عاشقان ہے ایک مقام پر جمع ہوئے کوئی گنا چھیل رہا ہے کوئی پونڈے پر چاقو تیز کر رہا ہے جا بجا پیالیوں میں افیون گھل رہی ہے۔ حقیقت تو یوں ہے کہ افیون کا گھولنا اور گنے کا چھیلنا بھی لکھنؤ والوں ہی کا حصہ ہے کہیں چائے تیار ہو رہی ہے اور داستان گو صاحب بہ لحن داؤدی فرما رہے ہیں.....ایک ایک فقرے پر سبحان اللہ اور واہ۔ واہ کی تعریف ہوتی جاتی ہے اور داستان گو کا دماغ عرش بریں سے گذر کر لامکاں کی خبر لاتا ہے۔''

وہ ادبی صنف جس کا تعلق اس طرح کی محفلوں سے ہو اس کو تصنیف کرتے ہوئے اس پر آداب محفل کے اثرات بھی ضرور پڑتے ہوں گے اور پھر آج کے معیار ادب پر جب ان کو پرکھا جاتا ہے تو اسے مہمل قرار دے کر داستان کے ساتھ ناانصافی کی جاتی ہے۔ ہر ادب کو اس دور کے سماجی اور تاریخی پس منظر میں دیکھنا چاہئے درد کے تصوف میر کے غم اور غالب کی فلسفیانہ شاعری میں جب ہم سماجی اثرات ڈھونڈھتے ہیں ان کے موضوع میں کوئی بے عملی نظر نہیں آتی ان کی مایوس کن شاعری جب ہمیں قنوطیت سے دوچار نہیں کرتی ان کے موضوع میں کوئی بے عملی نظر نہیں آتی ان کی اشک ریز شاعری ہمیں حقیقت سے دور نہیں لے جاتی تو پھر داستان کا جائزہ لیتے وقت

Scanned with CamScanner

داستان گوئی کے لوازمات کو بھی برسرنگاہ رکھنا چاہیے اس کے علاوہ اردو داستان نویسی کا ایک مقصد زبان اردو کو عام رواج دینا بھی تھا۔ فارسی ایک زمانے سے ہندوستانی فضا پر چھائی ہوئی تھی اور اسی زبان میں حکومت کے کام ہوتے تھے اور کوئی اہل ذوق اردو کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتا تھا شاعری میں تو کسی طرح اردو نے اپنا مقام بنالیا تھا لیکن نثر میں ۱۸ رویں صدی کے خاتمہ تک اس طرف کوئی توجہ نہیں ہوئی تھی ایسے ماحول میں جب کہ غالبؔ جیسا خوددار شاعر اپنی اردو شاعری کو نقش بے رنگ کہہ رہا ہو جس نے آج اسے عالمی شہرت دی۔ اردو نثر کا آغاز داستانوں سے ہوا ظاہر ہے دلچسپی کا قائم رکھنا اس کا ایک لازمی جزو بن گیا تا کہ زبان اردو کو قبول عام دیا جاسکے ایسے میں اس طرح کی زبان لکھنے کی ضرورت پیش آئی جو فارسی کی جگہ لے سکے اس لئے داستانوں میں زبان کی جولانیاں دکھائی جانے لگیں اور داستان نویس کی توجہ قصے سے زیادہ زبان و بیان کی خوبیوں پر رہتی تھی۔ لکھنؤ اور دلی کی داستانوں میں وہاں کی مقامی خصوصیات دیکھی جاسکتی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج میں لکھے گئے سارے قصے زبان سیکھنے اور اردو زبان کو قبول خاص و عام دینے کی غرض سے لکھے گئے اور یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر قصے ترجمہ ہیں جو قصے طبع زاد ہیں ان کا بھی مرکزی پلاٹ تقریباً وہی ہے جو دوسری داستانوں کا' مافوق الفطری عناصر ان سبھی داستانوں کا لازمی جزو ہیں' خیر کو شر پر فتح ان سبھی داستانوں میں حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ داستانیں ایک سحر آمیز اور لطیف فضا سے آشنا کرانے کے ساتھ ہی ساتھ ایک مخصوص قسم کی تہذیبی فضا کی عکاسی بھی کرتی ہیں بقول وقار عظیم:۔

> ''جس طرح غزل ہمارے مشرقی مزاج اور اس مزاج کے اکثر نازک اور پیچیدہ پہلوؤں کا عکس ہے۔ اسی طرح داستانیں ہماری تہذیبی زندگی اور اسکے بے شمار گوشوں کی مصور و ترجمان ہیں۔ جس طرح غزل کے حرف حرف میں ہمارے ساز دل کی ہر جھنکار اس شیشہ کی ہر کھنک سنائی دیتی ہے۔ اس طرح داستان کی ہر سطر میں تقریباً ڈیڑھ سو برس کی معاشرت، تہذیب اور انداز فکر و تخیل کا رنگ

Scanned with CamScanner

صاف جھلکتا اور چھلکتا نظر آتا ہے۔ غزل اور داستان دونوں ہماری
داخلی اور خارجی زندگی کی بڑی دلکش تصویریں ہیں۔'' ۱۲

چونکہ یہ داستانیں ادبی سرمائے سے زیادہ بیانیہ روایت ہیں اس لئے ان میں بیانیہ پہلوؤں کو نظر میں رکھ کر ہی داستان کی تخلیق ہوتی ہے اور سامعین کی توجہ کو اپنی طرف مرکوز رکھنے کی پوری کوشش کی جاتی تھی داستانوں کا کیوں کہ کوئی منظم پلاٹ نہیں ہوتا تھا اس لئے قصے میں تکرار اور طوالت کی بہت گنجائش ہوتی تھی۔ اس کے نمونے کے لئے صرف داستان امیر حمزہ اور بوستان خیال جیسی طویل داستانیں ہی کافی ہیں۔ داستانوں کے درمیان بہت سے موقعوں پر سامعین کا شوق اور تجسس برقرار رکھنے کیلئے داستان گو کسی موقع پر قصے کو روک کر بیان کو طوالت دیتے تھے کسی کی شادی یا جنگ کے کسی موقع پر جب سامعین پھر کیا ہوا؟ کے مشتاق ہوں ایسے میں داستان گو اپنی زبان کے جوہر دکھانا شروع کر دیتا تھا شاید وہ سامعین کی نفسیات سے واقف تھا کہ وہ پورا قصہ سنے بغیر چھوڑ بھی نہیں سکتے تھے۔ داستان کی طوالت اور سامعین کے اشتیاق کے حوالے سے ڈاکٹر ابن کنول نے ڈاکٹر اجمل اجملی کے حوالے سے ایک قصے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

''کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ کے کسی امیر کے یہاں ایک داستان گو قصہ گوئی
کے لیے ملازم تھا۔ وہ ایک داستان بیان کر رہا تھا کہ جس میں کسی
شہزادے کی برات کا ذکر تھا کہ برات سسرال کے دروازے تک پہنچ
چکی ہے اس دوران داستان گو کو کسی اشد ضروری کام سے باہر جانا
پڑ گیا امیر کے کہنے پر داستان گو داستان سنانے کے لئے اپنے شاگرد
کو مقرر کر گیا اور اس سے کہہ گیا کہ جلد واپس آؤں گا تم داستان کو
سنبھالے رکھنا داستان گو پندرہ دن بعد جب لوٹ کر واپس آیا تو
معلوم ہوا کہ برات ابھی بھی وہیں کھڑی ہے جہاں وہ چھوڑ کر گیا تھا
یعنی شاگرد نے برات کی شان وشوکت اور سسرال والوں کے
خیر مقدمی کے انتظامات کے ذکر میں گزار دئے شاگرد کے پندرہ دن

Scanned with CamScanner

کے بیان کے بعد استاد نے مزید پندرہ دن برات کی آرائش
وزیبائش کو بیان کر کے برات کو دروازے پر کھڑا رکھا۔ ۱۳

گویا تکرار وطوالت ، زبان وبیان کے جوہر، حسن وعشق کا بیان مافوق الفطری کردار وواقعات اردو داستانوں کے خاص وصف ہیں۔ جن داستانوں میں مافوق الفطری کردار نہیں ہیں وہاں بھی انسانی کرداروں سے جو واقعات سرزد ہوتے ہیں وہ غیر فطری ہیں۔

حواشی:

۱۔ گیان چند اردو کی نثری داستانیں، ص۔۲۴، بحوالہ کتھا ساگر از فضل حق قریشی ساقی جولائی ۱۹۳۶ء

۲۔ گیان چند۔ اردو کی نثری داستانیں صفحہ ۲۰ بحوالہ کیمرج اینشنٹ ہسٹری جلد اول صفحہ ۲۲۶۔

۳۔ گیان چند۔ اردو کی نثری داستانیں صفحہ ۲۰ بحوالہ قدیم افسانے از سروری۔

۴۔ گیان چند، اردو کی نثری داستانیں صفحہ ۲۰

۵۔ فن داستان گوئی کلیم احمد صفحہ ۳۰۔

۶۔ ساحری، شاہی، صاحب قرانی۔ شمس الرحمٰن فاروقی ۳۵

۷۔ اردو کی نثری داستانیں۔ گیان چند صفحہ ۳۸ بحوالہ History Snskrit Literature By Keeth

۸۔ اردو کی نثری داستانیں۔ پروفیسر گیان چند جین صفحہ ۴۰۔

۹۔ اردو کی نثری داستانیں پروفیسر گیان چند صفحہ ۹۶۔

۱۰۔ ادبی نثر کا ارتقاء۔ شہناز انجم صفحہ ۱۰۷۔ بحوالہ عبدالقادر سروری۔ دنیائے افسانہ

۱۱۔ دبستان لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقا۔ ڈاکٹر آغاز سہیل۔

۱۲۔ پیش لفظ ہماری داستانیں۔ وقار عظیم۔

۱۳۔ داستان سے ناول تک۔ ابن کنول صفحہ ۱۴۔

Scanned with CamScanner

قلی قطب شاہ کی شاعری میں ہندوستانی عناصر

قلی قطب شاہ کی شاعری میں ہندوستانی عناصر کا تجزیہ کرتے وقت اس عہد کے تاریخی پس منظر کا اجمالاً جائزہ لیں تو پتا چلتا ہے کہ جنوبی ہند میں وندھیا چل اور ست پُڑا کی پہاڑیوں سے متصل مالا بار اور کارومنڈل تک مشرقی اور مغربی ساحل کا درمیانی علاقہ زمانۂ قدیم سے اپنا جغرافیائی ماحول تہذیب وتمدن زبان ومیلانات کے تاریخی پس منظر کے ساتھ بعض منفرد خوبیوں کا حامل رہا ہے۔ جنوبی ہند کے اضلاع تلنگانہ جیسے زرخیز علاقے میں مختلف بادشاہوں نے حکمرانی کی اور یہیں قطب شاہی سلطنت قائم ہوئی آندھرا پردیش کے اس خوبصورت پُر فضا ماحول کی تعریف مارکو پولو اور میگستھنیز سے لے کر برنیر اور تھیولو تک ہر سیّاح نے پُر زور انداز میں کی ہے۔ شمالی ہند کے زیادہ تر سلاطین کی نگاہیں اسکے حُسن سے خیرہ تھیں۔ اورنگ زیب نے دکن کی اس خوبصورتی اور زرخیزی سے متاثر ہوکر کہا تھا ''یک قطعہ بے مزرع نیست''۔[1]

یہ بھی سچ ہے کہ قوموں کی ذہنیت اور طریقہ بود وباش کا تعین کرنے میں ملک، محل وقوع کے نشیب وفراز گرم وسرد ہواؤں کا بھی بڑا دخل رہا ہے دوسرا خاص محرک وہ تصوّر حیات اور فلسفۂ زندگی ہے جو کسی ملک کے دانشمند مفکر اور سیاسی وسماجی رہنما اپنے کردار کے ذریعہ پیش کرتے ہیں اور قوموں کے مزاج کو مخصوص سانچہ عطا کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ تمدن کی تعمیر وتشکیل میں جو محرکات کام کرتے ہیں ان میں جغرافیائی اور طبعی ماحول بھی بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

سلاطین دہلی میں سب سے پہلے علاء الدین نے دکن کی جانب رخ کیا۔ دیوگری سے لیکر مدورا تک اس نے خودمختار ریاستوں کو زیرِ نگیں کرکے اپنے ماتحت کرلیا لیکن مصلحتاً اس نے ان ریاستوں کو سلطنت کی سرحدوں میں شامل نہیں کیا۔ اس ضمن میں تغلق سلاطین میں محمد بن تغلق کا ذکر موزوں معلوم ہوتا ہے جو دہلی کے ساتھ دیوگری کو دولت آباد کے نام سے نئی دارالحکومت

---

[1] مسز زرینہ بیگم، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج، الہ آباد

Scanned with CamScanner

استوار کرنے میں کوشاں رہا حالانکہ پوری طرح کامیاب نہیں ہو پایا لیکن اس کے سماجی و ثقافتی اثرات دائمی ثابت ہوئے۔

دکن میں امیران صدہا ترک نظم و نسق کے ذمہ دار قرار دیئے گئے تھے جنھوں نے ۱۳۴۵ء میں ایک خود مختار بہمنی سلطنت قائم کرلی اور دہلی کے حکمرانوں سے باغی ہو گئے علاء الدین حسن بہمن شاہ اس حکومت کا بانی تھا اسی کے نام سے یہ سلطنت بہمنی کہلائی۔ یکے بعد دیگرے سلطانوں نے حکومت کی اور ۱۵۲۷ء میں بہمنی حکومت کا چراغ گل ہو گیا بعد ازاں منقطع ہو کر پانچ سلطنتوں میں پانچ اور حکومتیں تقسیم ہو گئیں۔ برار میں عماد شاہی خاندان (۱۴۹۰ تا ۱۵۷۴ء)، احمد نگر میں نظام شاہی (۱۴۹۰ تا ۱۶۳۳ء) بیدر میں بُرید شاہی (۱۴۸۷ تا ۱۶۱۹ء)، بیجاپور میں عادل شاہی (۸۹۵ھ تا ۱۰۹۷ھ) اور گولکنڈہ میں ہی قطب شاہی (۱۵۱۸ تا ۱۶۸۷ء) سلطنتیں قائم ہوئیں۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی کی تصنیف ''مقدمہ تاریخ دکن'' اور تاریخ گولکنڈہ، و نسنٹ اے اسمتھ کی '' دی آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا'' رفیع الدین شیرازی کی ''تذکرۃ الملوک،'' ابوالقاسم فرشتہ کی ''گلشن ابراہیمی،'' بشیرالدین کی ''واقعات مملکت بیجاپور''، ابراہیم زبیری کی ''بساتین السلاطین'' اور پروفیسر عبدالقادر سروری کی ''اردو کی ادبی تاریخ'' میں ان حکومتوں کے عروج و زوال کی داستانیں محفوظ ہیں مگر یہاں چونکہ قلی قطب شاہ کا ذکر مقصود ہے اس لئے صرف قطب شاہی حکومت کا اجمالی ذکر کیا جارہا ہے۔

تاریخ قطب شاہی "تذکرۃ الملوک "اور ''تاریخ فرشتہ'' کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ سلطان قلی کے دکن آنے کی خاص وجہ شاہانِ بہمنی کے ایران و ترکستان سے اچھے تعلقات تھے سلطان قلی جب اپنے چچا کے ساتھ دکن آیا اور محمد آباد بیدر میں قیام کیا تو اس وقت محمود شاہ بہمنی حکمراں تھا وہ سلطان قلی کی صلاحیتوں کی بنا پر اس کا گرویدہ ہو گیا اپنے علم و فضل کی وجہ سے قلی نے کافی ترقی کی اور جلد ہی بادشاہی میں اپنا خاص مقام بنالیا ۱۴۸۷ء میں سلطان کی جان بچانے اور ۱۴۹۴ء میں پنہالا کی بغاوت فرو کرنے کے صلہ میں "قطب الملک " کا خطاب حاصل کیا۔

Scanned with CamScanner

۱۵۱۸ء میں محمود شاہ کے انتقال پر بدنظمی کے آثار پیدا ہوئے تو قطب الملک نے تلنگانہ میں خود مختاری کا اعلان کر دیا اور "قطب شاہ" کہلایا نیز گولکنڈہ کو دارالسلطنت کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ سلطان قلی نے زیادہ تر وقت سلطنت کے استحکام کی تجویز اور سلطنت کی توسیع کی کاروائیوں میں گزارنے کے باوجود تمدنی امور کی طرف توجہ دی بقول ڈاکٹر زور "۔۔۔۔ آش خانہ کے نام سے ایک محل تعمیر کروایا گیا جہاں ادبی محفلوں کا انعقاد کیا جاتا تھا۔"

گولکنڈہ کا پانچواں تاجدار ابوالمظفر محمد قلی قطب شاہ ۲۱ ربیع الثانی ۹۸۸ھ مطابق ۵ جون ۱۵۸۰ء اپنے والد ابراہیم قطب شاہ کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا۔ [۲]

"بُستان آصفیہ" میں مانک راؤ ٹھل نے لکھا ہے کہ "علم دوست تھا اور اہل کمال کی قدردانی میں وہ کسی طرح اپنے اجداد سے کم نہیں رہا۔" [۳]

محمد قلی کا کلام ہندوستانی ماحول ہندو دیومالا اور ہندوستانی طرز فکر کے اثر سے لبریز اس کی حبّ الوطنی اور قوم پرستی کا شاہد ہے وطن کے ذرّہ۔ ذرّہ سے بے لوث محبّت، یہاں کے موسموں، دریاؤں، پہاڑوں، پھولوں، رسموں وتہواروں اور روزمرّہ زندگی میں جس قومی ہم آہنگی کو قلی نے اپنا مطمح نظر بنایا تھا اسکی متعدد مثالیں اس کے اشعار میں پائی جاتی ہیں ہندوستان کی ہر شئے سے اسکی والہانہ وابستگی ہے جو پورے تہذیبی پس منظر کے ساتھ ان کے کلام میں اجاگر نظر آتی ہے۔

محمد قلی کی شاعری اپنے دور کے تہذیبی عناصر کی مکمل عکاسی کرتی ہے جہاں ساری فضا ہندوستانی نظر آتی ہے محمد قلی نے اپنے دور کے زیورات، لباس، طرز معاشرت وثقافت سے متعلق جو معلومات اپنی شاعری کے ذریعہ بہم پہنچائی ہیں وہ یقیناً ہماری تہذیبی زندگی کا غیر معمولی اثاثہ ہیں جو ہندوستان کی تاریخ وثقافت اور زبان وادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔

محمد قلی کی شخصیت کی تعمیر میں ہندوستانی تہذیب وتمدّن اور طرز معاشرت کی اصل روح سانس لیتی دکھائی دیتی ہے جس کی اپنی انفرادی خصوصیات ہیں جہاں انھونے اپنے مذہبی

Scanned with CamScanner

خیالات کا اظہار کیا ہے وہاں بھی ہندوستانی طرز فکر اور کلچر کا اثر نمایاں ہے۔ پوجا پاٹھ کی رسومات میں آرتی کی خاص اہمیت ہے آئمہ مظہرین بزرگانِ دین سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے وہ اردگرد کے ماحول اور مشترکہ تہذیبی سرمائے کے اثرات سے دامن نہیں بچا سکے۔ ذیل میں لفظ ''آرتی'' کا برمحل استعمال اور اس سے ماخوذ خیالات کو اشعار میں کس خوبی سے ڈھال دیا ہے ۔

کرتے ہیں جیواں پیار تھے تم پر تھے رضواں آرتی
زہرا سوں نِس دن وارنے سو اتریا یا علی

محبت آرتی یوں وارتے ہیں جیوں ڈھال
سو موتی ڈھال دریا کا ں جھکا یا برس گانٹھ

حوراں طبق سو نور لا کے یاں جادو سوں
آرت ستارے سور چندا کرتے تج اوپر

ہندوستانی معاشرت کا ایک مظہر سندور بھی ہے اپنے ساقی نامہ میں محمد قلی یوں مخاطب ہیں ۔

پلک کانٹے نین باندے نہ جاوے خیال تیرے کُن
رقم اس خیال مو پیشانی کوں سندور کر ساقی

ہندوستان کی موسمی کیفیت اور اس کے زیر اثر چرند پرند پھل، پھول کے خوبصورت ذکر سے محمد قلی نے اپنی شاعری کو مزیّن کیا ہے گویا ان کی شخصیت پوری طرح ہندوستانی رنگ میں ڈھل گئی تھی۔ انکی ذہنیت کا جزو خاص بن گئی تھی۔ اسی جذبہ کے تحت شاعر ایران کے چرند پرند کے بجائے کھنجن (شیاما)، کوئل، چکور، مور یہاں تک کہ جگنو، کوّے، مینڈک کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دیتا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

Scanned with CamScanner

کوئل　　پریم کے بھید بن میں کوکی کوئل
سونا داں سوں پنکھرو سب ریجھائی

کھنجن　　زلف پیکھ میں پیو کے دل کے ہندولے
نین جگ امولے ہیں کھنجن تھے بھاری

جگنا (جگنو)　　جھمکتا رات کوں جگنا پیاری رات دن جھمکے
پیشانی پر رکھے جگن کا ٹیلا کدنا دیکھا کے

جانوروں میں ہرن، مگر مچھ، گج (ہاتھی)، چیتے، باگ، سانپ، مچھلی وغیرہ کو محمد قلی نے اپنا موضوع سخن بنایا ہے۔ اپنی ایک نظم جس کا موضوع "ہاتھی" ہے جس میں انھوں نے اس عظیم الجثہ جانور کے ڈیل ڈول، اس کی ہوشیاری، طاقت کی اچھی تصویر پیش کی ہے اور میدان جنگ میں اسکی فتح یابیوں کا ذکر کیا ہے۔

خدا کا ہست بہتا ہور جھرتا
دندے دشمن کے سر پر پاؤں دھرتا
انکس اس سیس پر قدرت نوا چند
کہ سنڈ پھانے میں دشمن نت نپڑتا

اسی طرح نسرین ونسترن اور لالہ وسوسن کے بجائے ہندوستانی پھولوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا کہیں گیندے کے پھول کھل رہے ہیں تو کہیں موگرا، کنول، سینوتی اور کنیر کے پھول کی مہک تو کہیں چندن اور کدم کا ذکر کرتے نظر آتے ہیں۔

محمد قلی ہی وہ پہلا شاعر ہے جس نے بیان کی دیگر وسعتوں کو تلاش کرنے کے لئے ''تنگنائے غزل'' سے نکلنا قبول کیا اس نے اپنے محلات حیدر محل، خداداد محل اور محل کوہِ طور وغیرہ کے نقشہ کو اپنے اشعار میں جس طرح پیش کیا ہے اردو میں توضیحی شاعری کے نہ صرف یہ اولین بلکہ عمدہ اور خوبصورت نمونے کہے جاسکتے ہیں۔ شان وشوکت اور خوبصورتی کے اعتبار سے خداداد محل

Scanned with CamScanner

قطب شاہی طرز تعمیر کا بے مثل نقش تھا محمد قلی نے اس کی تصویر اس طرح پیش کی ہے۔

خدا داد محل کوں حمد سنوارے
تو اس میں جنت کے نگاراں نگاراں
بلند محل کا ہے آسمان جیسا
سورج چاند تارے سو اس تھے سنگارے
نہ اس جگ میں دیکھے کوئی ایسا محل
مگر دھرت پر قدسیاں لیا کے ٹھارے
جوں آٹوں بہشت نمینے آتو جھجھے اس
خضر چشمے بہتے ہیں تس میں سدارے
جگت کوں حیاتاں بخشنے کے تائیں
جوں عیسٰی کے دم تِس میں بہتے ہیں تارے

محمد قلی ایک جامع شخصیت کے مالک تھے انھوں نے اپنی شاعری کو صرف عشق و محبت تک محدود نہیں رکھا بلکہ مظاہر قدرت و انسانی معاشرت پر بھی خاص توجہ دی خارجی زندگی اور ماحول کی عکاسی میں نظیر سے پہلے صرف قلی بے مثل نظر آتے ہیں محمد قلی کی توضیحی شاعری بہت وسیع ہے اسی نے بنولی، امباڑہ، منجل (تاڑ کا پھل) کو بھی اپنے کلام میں جگہ دی اور ہندوستانی پھلوں، پودوں ترکاریوں یہاں تک کہ بڑ بڑول کی بھی تعریف میں شعر کہے۔

محمد قلی نے اپنے عہد کے کھیلوں مثلاً چوگان کھمڈی، کولانٹ، ناٹک اور "پھوکڑی پھو" کو بھی شعر کی صورت عطا کی۔ راگ راگنیاں، کھیل تماشے، مہندی اور بسنت کی بہاریں اس کی فکر کو اسیر کر لیتی ہیں مضامین کا یہ تنوع و رنگارنگی بہت کم شعرا کے یہاں ملے گی۔

محمد قلی کے کلام میں وہ مزاج و مذاق واضح ہے جو اس کے خیالات کے تحریک کا باعث ہیں اس نے اپنی شاعری میں طرح۔ طرح کی تقریبات، تہواروں اور موسموں کا خصوصیت سے

Scanned with CamScanner

ذکر کیا ہے وہ محلوں میں عید اور مختلف جشن و تقریبات کا ذکر کرتے وقت بڑی جدّت سے کام لیتے ہیں جشن کی دھوم دھام، محلوں کی چہل پہل، آراستگی، عید کا اہتمام، آتش بازی اور مختلف ساز کے استعمال میلوں کی بہار لوگوں کی خوش پوشی کی بڑی موثر تصویریں انکی شاعری میں نظر آتی ہیں مولوی عبدالحق رقمطراز ہیں :

''محمد قلی نے اپنے دور کے مختلف رسم و رواج، برسات اور دیگر موضوعات جیسے ہولی، پان سوکا اور بسنت اور اپنے ہاتھی پر نظمیں لکھی ہیں۔۔۔اس کی نظر وسیع تھی اور وہ عشق و محبت کے کوچے سے باہر نکل کر قدرت کی خوبیوں کی داد دے سکتا ہے۔'' [۴]

دکن میں برسات کے موسم کی اپنی خاص اہمیت تھی اور کچھ محمد قلی کی ذاتی وابستگی اور دلچسپی نے اسے وہ ہمہ گیری عطا کی کہ یہ تہوار کی شکل میں رونما ہوا فطرت کے مناظر نئے انداز میں سامنے آئے جو دل میں تازگی، شگفتگی کے ساتھ ساتھ شادمانی کا جذبہ بھی پیدا کرتے ہیں انہیں خصوصیات کی بنا پر موسم باراں کو ایک قومی تہوار کی شکل میں پیش کیا گیا۔ یہ ایک ایسا خالص غیر مذہبی اور ہندوستان میں وقوع پزیر ہونے والا موقع تھا جسکی معاشرتی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

غرض کہ محمد قلی کو ہر مقبول رسم و رواج، اور موقع و محل کی کیفیت سے ایسا جذباتی تعلق تھا کہ اس نے انھیں اپنی شاعری کا جزو خاص بنا دیا اور بجا طور پر ہندوستانیت کا پرستار کہلانے کا مستحق قرار پایا۔

موسموں کی سحر آگیں فضا و دلکشی میں محو ہو جانے کا انداز قلی کو سنسکرت شعرا سے نزدیک تر کر دیتا ہے چوں کہ ہندوستانی مخلوط تہذیب اس کے رگ و پے میں رچ بس گئی تھی اس نے موسموں کی تصویر کشی میں دکنی تہذیب کو پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ بسنت کو عموماً ہندوستان میں بہار کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے۔ دکن میں خصوصاً اس کی اہمیت کے پیش نظر انتہائی خیر مقدم کرتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

محمد قلی کی شاعری میں صرف جشن بہاراں اور بسنت کا ہی ذکر نہیں بلکہ موسم سرما کی بھی خاص اہمیت ہے وہ اس رنگین موسم میں "پیا باج دیکھے" "نہیں رہ سکتا" "سیتل ہوا" اور "چندنی" "پیا بن" بے کیف معلوم ہوتی ہے یہاں تک کے شمع کے "مکھ" پر بھی اُجالا نظر نہیں آتا ۔

ہوا آتی ہے لے کر ٹھنڈ کالا   پیا بن سنتا تا مدن بالے بالا
رہن نہ سکے من پیا باج دیکھے   ہووے تن کوں سکھ جب ملے پیو بالا
اے سیتل ہوا منج گلے نا پیا بن   مگر پیو کنٹھ لا کرے منج نہالا
سجن مکھ شمے باج اوجالا نہ بھاوے   بھلا یا ہے منج جیوں کوں او او جالا
جورات آوے چندنی کی منجکو ستاوے   کہ چند نا منجے نہیں نین سور لالا

مرگ یا آغاز باراں ایک خالص ہندوستانی تہوار تھا جسے محمد قلی نے قومی تہوار بنا دیا یہ اس کی اپنی ذاتی دلچسپی کے سبب ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ گرمی کی شدّت کے بعد جب بارش کا پہلا قطرہ زمین پر گرتا ہے تو وہ حیات انسانی کے لئے مسّرت کا سرچشمہ بن جاتا ہے اور حیوان و نباتات کے لئے نئی زندگی کا پیام لاتا ہے۔ ہر طرف شادابی نظر آتی ہے گویا مُردہ زندگی میں جینے کا احساس پیدا ہو جاتا ہے ایسے خوبصورت موضوع پر محمد قلی نے بڑے عمدہ اشعار کہے موسم باراں کی آمد کا دلفریب و دلکش منظر اس طرح پیش کیا کہ اس تہوار کی قومی یگانگت، یکجہتی و ہم آہنگی ظاہر ہو گئی وہ ایک بے مثل غزل گو ہی نہیں بلکہ اپنی اس طرح کی موضوعاتی نظموں میں بھی بے مثل نظر آتے ہیں۔ پروفیسر اعجاز حسین لکھتے ہیں :

> "اس کی رومان پسند طبیعت کے علاوہ دکن کی برسات نے بھی اس کو جذبات کی ترجمانی کے لئے مائل کیا کہ اس موسم کی آمد کا استعمال اس رنگ سے کرے کہ برسات کو بھی اپنی اہمیت کا اندازہ ہو جائے اور قدردانی کا احساس زیادہ سے زیادہ اس کو مائل بہ کرم کرے۔" ۵

محمد قلی ایک منفرد طرز ادا کا مالک تھا اس کا کلام الفاظ کی بازی گری نہیں اس کی

Scanned with CamScanner

قادرالکلامی اور زور زبان کا ثبوت اس کے مختلف متنوع موضوعات ہیں جہاں وہ معنی آفرینی کو شاعری میں مخصوص جگہ دیتا ہے اور شاعری محض لفظی شعبدہ بازی نہیں بلکہ معنی کی اہمیت سے پہچانی جاتی ہے ۔

عشقاں کی آتش تھے کدھیں یک تل نہ بیجوں معنیاں
کافر کے مُکھ اوپر بند یا ہوں چھند ستیں عنصری

شعر میں ندرت خیال اور تازگی کے لئے وہ تازہ مضامین باندھنے پر زور دیتا ہے اور شعر گوئی کے متعلق اس کا نظریہ ہے کہ اچھے شعر اور شعر کی نزاکت کو صرف شاعر ہی پرکھ سکتا ہے نتشاعر نہیں ۔

باتاں کی نزاکت بن شاعراں نہ بوجھیں
دیتا خدا قطبؔ کوں ہے گفتار کا متاع

قلی قطب شاہ ایک ادب نواز اور ہر دلعزیز بادشاہ تھا اس کا دربار شعرا و ادبا کا مستقر بنا ہوا تھا اس کا کلام عوام و خواص دونوں میں یکساں مقبول تھا دربار سے لیکر حرم سرا تک اس کی غزلیں ساز پر گائی جاتی تھیں فنِ رقص کے ماہرین اور گلوکار بادشاہ کی نظر کرم حاصل کرنے کے لئے محمد قلی کے کلام کو بڑے اہتمام کے ساتھ پیش کرتے تھے ۔

محمد قلی کی کلیات میں اکثر مقامات پر ایسے اشارے موجود ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ وہ رقص و موسیقی کا ماہر ہی نہیں بلکہ اس کی مظاہر فطرت اور موسموں کی نقش آرائی کے درمیان موسیقیت کے عناصر اور آگہی کی مختلف صورتیں بھی تلاش کر لیتا تھا۔ اُن کی نظموں میں مختلف ہندوستانی باجوں کے نام کثرت سے ملتے ہیں۔ مردنگ، شنکھ، طنبورہ، کنگری (ایک قسم کی بین)، منڈل (ڈھول)، بین ٹم ٹمیاں اور طبلہ کا بار بار ذکر آتا ہے۔

انسانی جذبات سے ہم آہنگ محمد قلی قطبؔ شاہ کے اس فطری لگاؤ کا ثبوت اس کے وہ خوبصورت اشعار ہیں جسمیں شاعر نے اس ماحول کی عکاسی کی ہے جس کی فضا میں نغمے کی صدا دل

Scanned with CamScanner

کو محظوظ کرتی ہے اور انسانی جذبات کی سچّی تصویر سامنے آجاتی ہے جن سازوں کے نام انکے کلام میں بار بار شعر بن جاتے ہیں۔ چند اس طرح ہیں ملاحظہ ہوں۔

شنکھ	مرے سنگ مل بجاتی شنکھ گاتی اسنگھرا ابھرن سری داگاں جو گاتی استری توں منجکوں بھاتی ہے
ٹم ٹمیاں	سورج چندا بے تال ہوکر بجیں نت منڈل ہو فلک ٹم ٹمیاں بجایا
پکھاوج	نین بھاؤ متیں پکھاوج بجائے پرم چوری پرند بھاواں دکھائی
طنبورہ	کنگیری میں اپ راگ گا کر دھن ہت سوں پیالے میں موکوں پلائے

مختصر یہ کہ محمد قلی کے اشعار میں جاذبیت، رنگینی، دلکشی کی کمی نہیں سادگی، بے ساختگی اور روانی اس کی طرز ادا کا خاص حصّہ ہیں اس نے اپنے دور کی عام فہم اور سادہ زبان کا استعمال کیا اسی سادہ رنگین تغزل نے اس کی شاعری میں رعنائی پیدا کردی یہی وجہ ہے کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ان کے اشعار اہمیت کے حامل ہیں۔

اجمالی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ محمد قلی نے ہندوستانی عناصر کو اپنے کلام میں اس طرح سمویا ہے کہ گنگا جمنی زبان وتہذیب کا تصوّر خود بخود جاگ اُٹھتا ہے جس کی تعمیر وتشکیل میں ہندو اور مسلمان دونوں کا اہم کردار تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ محمد قلی جیسا قادرالکلام شاعر اور زبان داں اُس کے ہم عصر شعرا اور اس سے ماقبل شعرا میں کوئی اور نہ تھا اس نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی اور اپنے کلام کا لوہا منوایا اور ہندوستانی عناصر و گنگا جمنی طرز اظہار کو اختیار کر کے اردو شعر و ادب کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔

Scanned with CamScanner

حوالہ جات :

۱۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ، مرتبہ ڈاکٹر سیّدہ جعفر

۲۔ محمد مفید متوفی مخطوطہ تاریخ سلطان قلی قطب شاہ، بحوالہ کلیات قلی قطب شاہ، ص۔۲۴

۳۔ مانک راؤ ٹھل، بستانِ آصفیہ، ص۔۲۹

۴۔ کلام سلطان محمد قلی قطب شاہ، از مولوی عبدالحق، بحوالہ کلیات قلی قطب شاہ، از سیّدہ جعفر، ص۔۱۴۳

۵۔ اردو شاعری کا سماجی پس منظر از پروفیسر سید اعجاز حسین، ص۔ ۱۱۷

Scanned with CamScanner

اقبال کے اردو اشعار میں ذکر انبیاءؑ

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّنْ قَبْلِکَ مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَیْکَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ نَقْصُصْ عَلَیْکِ ط وَمَا کَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ یَّاْتِیَ بِاٰیَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ج [1]

''اور ہم نے آپ سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے جن میں بعضے تو وہ ہیں کہ ان کا قصہ ہم نے آپ سے بیان کیا ہے اور بعضے وہ ہیں جن کا ہم نے آپ سے قصہ بیان نہیں کیا اور (اتنا امر سب میں مشترک ہے کہ) کسی رسول سے یہ نہ ہوسکا کہ کوئی معجزہ بدون اذن الٰہی کے ظاہر کر سکے۔''

انبیاء کرام کی حیات، سیرت و کردار اور تعلیمات کی وضاحت بھی درحقیقت حقائق اسلام کی تشریح و تفسیر ہے اور اقبال کے نزدیک حقائق اسلام کی نشر و اشاعت سب سے بڑی خدمت ہے۔ شائقین اردو کے لئے مقالہ میں اقبال کے اردو اشعار میں مذکور حضرت آدمؑ سے ختم رسل حضرت محمد ﷺ کی حیات، تعلیمات و حکمات کے بعض قصوں کو قرآن کے حوالہ سے مختصراً پیش کیا گیا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمام فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ سب نے سجدہ کیا، لیکن ابلیس نے غرور و تکبر کی وجہ سے انکار کر دیا۔ قرآن پاک کی درج ذیل آیت میں اسی واقعہ کا بیان ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ط اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ. [2]

''اور جس وقت حکم دیا ہم نے فرشتوں کو (اور جنوں کو بھی) کہ سجدے میں گر جاؤ آدم کے سامنے سو سب سجدے میں گر پڑے بجز ابلیس کے اس نے کہنا نہ مانا اور غرور میں آ گیا اور ہو گیا کافروں میں سے۔''

اسی کا ذکر اقبال نے ان اشعار میں کیا ہے ۔

ڈاکٹر نذرت محمود ، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ عربی، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج، الہ آباد

Scanned with CamScanner

اے خدائے کن فکاں مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر
آہ! وہ زندانیِ نزدیک و دُور و دیر و زود
حرفِ استکبار ، تیرے سامنے ممکن نہ تھا
ہاں مگر تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود! ۳

حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت نوح علیہ السلام پہلے نبی ہیں جنہیں منصب رسالت سے سرفراز فرمایا گیا۔ قرآن کریم کے معجزہ نما کلام میں یہ خصوصیت ہے کہ جب تاریخی واقعات بیان کرتا ہے تو اپنے مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے واقعہ کی ان جُزئیات کو بیان کرتا ہے جو مقصد کے لئے ضروری ہیں اور واقعہ کی جزئیات، اجمال اور تفصیل وتکرار میں پندونصائح کا ہی مقصد سامنے ہوتا ہے چنانچہ اسی اندازِ بیان کے مطابق قرآن پاک میں حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر اجمالی وتفصیلی انداز میں ۴۳/مقامات پر ہے، لیکن اس واقعہ کی اہم تفصیلات سورہ الاعراف، ہود، المؤمنون، الشعراء، القمر اور نوح میں ملتی ہیں۔ ۴

حضرت نوح علیہ السلام قوم کو دعوتِ توحید ودعوت حق دیتے رہے اور قوم کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے مگر قوم رحمتِ الٰہی کی آغوش میں آنے پر مائل نہ ہوئی اور بت پرستی میں لگی رہی، ان پر دعوت وتبلیغ کا کچھ اثر نہ ہوا تو نوحؑ نے اللہ سے دعا کی۔

وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَاتَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا . اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْا اِلَّا فَاجِراً كَفَّاراً ۔ ۵

''اور نوحؑ نے کہا اے میرے پروردگار کافروں میں سے زمین پر ایک باشندہ بھی مت چھوڑ کیوں کہ اگر آپ ان کو روئے زمین پر رہنے دیں گے تو یہ لوگ آپ کے بندوں کو گمراہ ہی کریں گے اور ان کے محض کافر اور فاجر ہی اولاد پیدا ہوگی۔''

تو حضرت نوح علیہ السلام کی طرف وحی کی گئی کہ اب تمہاری قوم میں سے کوئی ایمان نہ لائے گا، چنانچہ آپ نے حکم الٰہی سے کشتی تیار کرنی شروع کردی جیسا کہ حکم ربانی ہے۔

Scanned with CamScanner

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ - ۶ے

''اور ہماری نگرانی میں اور ہمارے حکم سے کشتی تیار کرلو اور مجھ سے کافروں کے بارے میں گفتگو مت کرنا، وہ سب غرق کیئے جائیں گے۔''

اقبال کے ذہن پر دعاے نوح نے کافی گہرا اثر چھوڑا ہے اسی لئے جب وہ اللہ تعالیٰ سے تبدیلیِ حالات کی دعا مانگتے ہیں تو نوح کی کشتی کو بچانے والے کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔

کلام اقبال میں انہیں کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

لے چلا بحرِ محبت کا طلاطم مجھ کو
کشتیِ نوحؑ ہے ہر موجۂ قلزم مجھ کو
اے کہ تھا نوحؑ کو طوفاں میں سہارا تیرا
اور ابراہیمؑ کو آتش میں بھروسا تیرا
دیکھ اے نوحؑ کی کشتی کو بچانے والے
آیا گرداب حوادث میں سفینہ اپنا
اس مصیبت میں اگر تو بھی ہماری نہ بنے
اور ہم کس سے کہیں جا کے فسانہ اپنا ۷ے

کلامِ اقبال میں مذکور انبیاء کرام میں ایک اہم نام **حضرت ابراہیم علیہ السلام** کا ہے۔ اقبال نے حضرت ابراہیمؑ کی سیرت سے جن واقعات کو تلمیحاتی انداز میں بیان کیا ہے ان میں ایک پیغام ہے۔ انہوں نے ان واقعات و نتائج سے پند و نصائح کے عظیم خزانے و جواہر ریزے چنے ہیں۔ آپ شروع ہی سے بصیرت حق رکھتے تھے اس لئے بتوں کی پرستش بناوٹ اور خرید و فروخت سے نفرت کرتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ جب مرتبۂ نبوت پر فائز ہوئے تو سب سے پہلے آذر کو بت پرستی سے منع کیا، اور قوم کے سامنے اعلان حق کیا۔ لیکن بت پرست قوم نے حضرت ابراہیمؑ

Scanned with CamScanner

کی ایک نہ سنی اور اپنے معبودوں کی طرح گونگے اندھے اور بہرے بن گئے۔ اور باپ دادا کے دین پر ڈٹے رہے۔ ۸ حضرت ابراہیمؑ کی تبلیغ کے باوجود قوم نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تو آپ نے ایک دن بت خانہ میں رکھے تمام بتوں کو توڑ دیا۔ نتیجتاً نمرود نے اپنی ربوبیت کو بچانے کے لئے اپنے مشیروں کے مشورہ سے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالنے کا حکم دے دیا۔ لیکن آگ نے آپؑ کو ذرا بھی نقصان نہ پہنچایا اور بحکمِ الٰہی کئی دن رہے۔ قرآن پاک میں اس پُر اعجاز واقعہ کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے۔

قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْا آلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِيْنَ . قُلْنَا يَا نَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ. وَاَرَادُوْ بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ۔ ۹

''وہ لوگ کہنے لگے کہ ان کو آگ میں جلا دو اور اپنے معبودوں کا بدلہ لو۔ اگر تم کو کچھ کرنا ہے۔ ہم نے حکم دیا کہ اے آگ تو ٹھنڈی اور بے گزند ہو جا ابراہیمؑ کے حق میں۔ اور ان لوگوں نے ان کے ساتھ برائی کرنا چاہا تھا۔ سو ہم نے ان ہی لوگوں کو ناکام کر دیا۔''

سب سے اہم بات جو اقبال بتانا چاہتے تھے کہ آگ سے آپ کی سلامت واپسی اس طرف اشارہ کر رہی ہے کہ آپ تلاش حق میں مختلف مراحل سے گزر رہے ہیں، اقبال کہتے ہیں۔

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے،
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے ۱۰

علامہ اقبال کے نزدیک حضرت ابراہیمؑ کا ایمان سچے عاشق کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر آج بھی اپنے اعتقاد کو حضرت ابراہیمؑ کی طرح پکا، محکم اور غیر متزلزل بنالیں تو وقت کے نمرود انھیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے۔

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا ۱۱

حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی انبیا میں نمایاں ہیں لیکن آپ کی پیدائش کی تفصیلات تو

Scanned with CamScanner

قرآن مجید میں نہیں آئی ہیں البتہ ایک سچے اور وعدے کے پکے نبی کی حیثیت سے قرآن مجید آپ کا تعارف کراتا ہے۔ ۱۲

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِسْمٰعِيلَ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَبِيًّا. ۱۳

"اور کتاب میں اسماعیل کا بھی ذکر کیجئے بلاشبہ وہ وعدے کے سچے تھے اور رسول بھی تھے اور نبی بھی تھے۔"

حضرت اسماعیلؑ کا ذکر حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ تو بکثرت آیا ہے۔ لیکن مستقل طور پر آپ کا تذکرہ سورہ البقرہ، الانعام، النساء، ابراہیمؑ، الصافات، مریم اور الانبیاء میں ملتا ہے۔ اللہ کے حکم کے مطابق حضرت ابراہیمؑ حضرت ہاجرہ اور شیر خوار بچے اسماعیلؑ کو ملک شام سے کعبہ کے قریب ایک بے آب و گیاہ میدان میں کچھ کھجور اور پانی کا ایک مشکیزہ دے کر واپس جانے لگے تو بی بی ہاجرہ آپ کو پکڑ کر پوچھتی ہیں کہ کیا یہ اللہ کا حکم ہے اور ہاں میں جواب سن کر وہ مطمئن ہو جاتی ہیں کہ اللہ انہیں ضائع نہیں فرمائے گا۔ اس کے بعد کچھ دور جانے پر حضرت ابراہیمؑ اپنے رب سے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے ہیں۔

"رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ۔ ۱۴

"اے ہمارے رب میں اپنی اولاد کو آپ کے معظم گھر کے قریب ایک میدان میں جو زراعت کے قابل نہیں آباد کرتا ہوں۔ اے ہمارے رب تاکہ وہ لوگ نماز کا اہتمام رکھیں تو آپ کچھ لوگوں کے قلوب ان کی طرف مائل کر دیجئے اور ان کو پھل کھانے کو دیجئے تاکہ یہ لوگ شکر کریں۔"

اقبال حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کو استاد و شاگرد کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ وہ حضرت اسماعیلؑ کے آدابِ فرزندی، صبر اور تسلیم و رضا کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں:۔

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندی ۱۵

Scanned with CamScanner

قرآن مجید نے حضرت ابراہیم کو کعبۃ اللہ کا اولین معمار قرار دیا ہے اور آپ کے بیٹے حضرت اسماعیل بھی اس کے معمار اول شمار کئے گئے ہیں۔ اگرچہ بیت اللہ کا وجود پہلے دن سے تسلیم شدہ ہے۔ لیکن اس کی باقاعدہ تعمیر اور عمارت کا بنانا حضرت ابراہیم سے پہلے وجود میں نہ آیا تھا۔ اس طرح اقبال اسلام کی داستان حرم کی ابتدا اسماعیل کو ٹھہراتے ہیں۔

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم

انتہا اس کی حسینؑ ابتدا ہے اسماعیل ۱۶؎

قرآن حضرت یعقوبؑ کا ذکر جلیل القدر نبی، صاحب صبر وعزم اور یوسف کے والد کی حیثیت سے کرتا ہے۔ قرآن پاک میں حضرت یعقوبؑ کا ذکر سورۃ البقرہ، النساء، الانعام، مریم، الانبیاء، یوسف، ص اور مومنون میں ملتا ہے۔ قرآن کے مطابق حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹے یوسف کو بہت چاہتے تھے۔ ان کے بھائیوں کے لئے یہ چاہت یہ محبت ناقابل برداشت تھی اور جب یوسفؑ نے خواب دیکھا تو یعقوبؑ خواب سن کر بہت خوش ہوئے اور اسے دوسروں کے سامنے بیان کرنے سے منع فرمایا۔ یہ واقعہ یوسفؑ کے بھائیوں کے لئے مزید حسد کا باعث بنا۔ اور بالآخر ان کے بھائی یعقوبؑ کے نہ چاہتے ہوئے بھی یوسف کو لے گئے اور پھر وہی ہوا جس کا یعقوبؑ کو اندیشہ تھا۔ بھائیوں نے انہیں کنویں میں ڈھکیل دیا اور ان کا کرتا جھوٹے خون میں لت پت کر لے آئے اور یعقوبؑ کو بتایا کہ انہیں بھیڑیا کھا گیا۔ یعقوبؑ بہت رنجیدہ ہوئے اور یوسفؑ کی جدائی سے روتے روتے ان کی آنکھوں کی روشنی جاتی رہی لیکن انہوں نے صبر کیا اور امید کا دامن نہیں چھوڑا وہ بیٹوں سے مخاطب ہیں۔

وَجَاءُ وَاعَلٰی قَمِیصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ. قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ط فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ ط وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَاتَصِفُوْنَ ۔۱۸؎

''اور یوسفؑ کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون بھی لگالائے تھے۔ یعقوبؑ نے فرمایا کہ بلکہ تم نے اپنے دل سے ایک بات بنائی ہے سو صبر ہی کروں گا جس میں شکایت کا نام نہ ہوگا اور جو

Scanned with CamScanner

باتیں تم بناتے ہو ان میں اللہ ہی مدد کرے۔"

اسی کا ذکر اقبال یوں کرتے ہیں۔

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینہ ادراک میں ہے
نہ ستارے میں ہے نے گردش افلاک میں ہے
تیری تقدیر مرے نالۂ بے باک میں ہے
کیا عجب ! میری نواہائے سحر گاہی سے
زندہ ہو جائے وہ آتش کہ تری خاک میں ہے [19]

اقبال نے حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت کے حقیقی پہلوؤں کو کئی حوالوں سے اجاگر کیا ہے، قرآن کریم میں حضرت یوسفؑ کا ذکر متعدد مقامات پر ملتا ہے۔ قرآن نے یوسف کے واقعہ کو "احسن القصص" کہا ہے کیوں کہ اس ایک واقعہ میں بہت عبرتیں، حکمتیں اور مواعظ و نصیحتیں ملتی ہیں۔ حضرت یوسفؑ کو عزیز مصر نے لے لیا تھا۔ اور عزیز مصر کی بیوی کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا اس کی پاداش میں آپؑ قید میں رہے۔ اور قید خانہ کی زندگی سے رہائی کے بعد عزیز مصر نے آپ کو مصر کا مالک و مختار بنا دیا، مختار کل بننے کے بعد آپ نے خواب سے متعلق تمام تدابیر اختیار کیں تا کہ رعایا قحط سالی کے دنوں میں بھی بھوک اور پریشانی سے بچی رہے۔ مصر میں جب قحط سالی ہوئی تو مصر کے اردگرد کے علاقہ کے لوگوں نے عزیز مصر کے اعلان کا فائدہ اٹھایا چنانچہ یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کو بھی قرآن کے مطابق مصر بھیجا۔ اور یوسفؑ نے بھائیوں کو پہچان لیا۔ اور جب یوسف کو اپنے والد کے رونے اور آنکھوں کی روشنی جانے کا علم ہوا تو یوسفؑ نے بھائیوں کو معاف کرتے ہوئے اپنا کرتا یعقوبؑ کی آنکھوں پر ڈالنے کو کہا جسکا ذکر قرآن میں ہے:۔

فَلَمَّا اَنْ جَاءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ط قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔[20]

Scanned with CamScanner

''پس جب خوش خبری لانے والا آپہونچا تو اس نے وہ کرتا ان کے منہ پر لا کر ڈال دیا۔ بس فوراً ہی ان کی آنکھیں کھل گئیں آپ نے فرمایا کیوں میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ اللہ کی باتوں کو جتنا میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے''

اقبال نے اس واقعہ کی طرف یوں اشارہ کیا ہے ۔

عشق یعقوب کا تو محرم اسرار تو ہو
پیرہن دے گا دکھا تجھ کو پسر کی صورت ۱۲

خطیب الانبیاء حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم کا ذکر قرآن حکیم میں سورہ الاعراف، الشعراء الحجر اور العنکبوت میں ملتا ہے۔۲۲ اقبال کے کلام میں مرشد کامل حضرت شعیبؑ کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں دیکھئے ۔

دم عارف نسیم صبح دم ہے
اسی سے ریشۂ معنیٰ میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے ۲۳

اقبال نے اسلامی تاریخ کی جن اہم شخصیات کو قوت و دانائی کے تصور کی وضاحت کے لئے اپنی تخلیقی فکر کا حصہ بنایا ہے ان میں ایک نمایاں نام حضرت موسیٰؑ کلیم اللہ کا ہے۔ فرعون بنی اسرائیل کا دشمن اس لئے بن گیا کہ اس زمانہ کے کاہنوں، نجومیوں اور قیافہ شناسوں نے اس کی حکومت کے زوال کا سبب ایک اسرائیلی لڑکے کو بتایا تھا، چنانچہ فرعون نے اس زمانہ میں پیدا ہونے والے اسرائیلی لڑکوں کے قتل پر ایک گروہ مقرر کیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کی والدہ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ بچہ کو دریا میں بہا دیا جائے ہم اس کے محافظ ہوں گے۔ ۲۴

موسیٰؑ فرعون کے محل میں پلے اور جوان ہوئے۔ اقبال کے کلام میں موسیٰ و فرعون پر متعدد اشعار ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ۔

Scanned with CamScanner

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے
ضرب کاری ہے اگر سینے میں ہے قلب سلیم
اس کی بڑھتی ہوئی بے باکی و بے تابی سے
تازہ ہر عہد میں ہے قصۂ فرعون وکلیم ۲۵

موسیٰؑ نے کوہ طور پر جانے کے وقت ہارونؑ کو اپنا نگراں بنایا تھا۔ لیکن ان کی قوم نے اس درمیان سامری کے جادو میں پھنس کر بچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔ جس کی اطلاع اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کو بذریعہ وحی دی۔ پیش ہے سورہ اعراف کی آیت:۔

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسیٰ مِنْ م بَعْدِہٖ مِنْ حُلِیِّھِمْ عِجْلاً جَسَداً لَہٗ خُوَار ط اَلَمْ یَرَوْ اَنَّہٗ لَایُکَلِّمُھُمْ وَلَا یَھْدِیْھِمْ سَبِیْلاً اِتَّخَذُوْہُ وَ کَانُوْا ظٰلِمِیْنَ. ۲۶

''اور موسیٰؑ کی قوم نے ان کے بعد اپنے زیوروں کا ایک بچھڑا ٹھہرا لیا۔ جو کہ ایک قالب تھا، جس میں ایک آواز تھی کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ وہ ان سے بات تک نہیں کرتا تھا اور نہ ان کو کوئی راہ رتلاتا تھا۔ اس کو انہوں نے معبود قرار دیا۔ اور بڑا بے ڈھنگا کام کیا۔''

اسی تعلق سے اقبال کا شعر ملاحظہ ہو ۔

خون اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰؑ طلسم سامری ۲۷

اقبالؔ نے حضرت موسیٰؑ کا ذکر اپنے کلام میں کثرت سے کیا ہے کیونکہ انہیں موسیٰؑ کی حیات وواقعات سے گہرا تعلق تھا یہ اس کا بڑا ثبوت ہے کہ انہوں نے اپنے مجموعۂ کلام کا نام ضرب کلیم رکھا۔

اسی طرح سورہ کہف میں مذکور حضرت خضرؑ کی معیت میں موسیٰؑ کے ذریعہ پوچھے گئے تینوں سوالوں کشتی، معصوم بچے کے قتل اور یتیم کی دیوار کے طویل قصوں کو ایک شعر میں ڈھال دیا ہے ۔

'کشتی مسکین' و 'جان پاک' و 'دیوار یتیم'
علم موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش ۲۸

Scanned with CamScanner

حضرت داؤد علیہ السلام کثرت سے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرتے تھے۔ آپ بہت خوش الحان تھے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے نظیر نغمہ عطا کیا تھا۔ عام حالت میں آپ زبور کی تلاوت فرماتے یا اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا میں مشغول ہوتے آپ کے پُرکشش اور سوز وگداز سے بھرے نغموں سے، انسان، وحوش اور اڑتے ہوئے پرندے کھینچے چلے آتے اور آپ کے اردگرد جمع ہو جاتے۔ ساتھ مل کر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے گیت گاتے۔ ۲۹

اقبال کے مجموعہ کلام زبور عجم میں اول سے آخر تک اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتعریف ہے۔ اقبال نے اس سے متاثر ہو کر اپنے شعری مجموعہ کو یہ نام دیا ہے جو عجمی زبان میں ہے۔ اسی لئے اہلِ ذوق اسے پڑھنے کی سفارش کرتے ہیں۔

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبور عجم
فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں ۳۰

حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر بھی اقبال تعمیر شخصیت اور کردار سازی کے ضمن میں کرتے ہیں۔ لیکن انسان کی سیرت سازی کے سلسلہ میں آپ کی سیرت کے جو پہلو اقبال کی دلچسپی کا باعث بنے ان سے انہوں نے مختلف نکات اخذ کئے وہ خاتم سلیمان مور بے مایاں کی تلمیحات ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کے پاس ہوا میں پرواز کرنے والا ایک تخت تھا۔ وہ جن وبشر اور پرندوں وغیرہ پر بھی حکومت کرتے تھے۔ اقبال نے ان واقعات کو اس طرح دکھایا ہے۔

جس سے تیرے حلقۂ خاتم میں گردوں تھا اسیر
اے سلیماں! تیری غفلت نے گنوایا وہ نگیں ۳۱
مشکلیں امت مرحوم کی آساں کر دے
مورِ بے مایہ کو ہم دوش سلیماں کردے
جنس نایاب محبت کو پھر ارزاں کردے
ہند کے دیر نشینوں کو مسلماں کردے ۳۲

Scanned with CamScanner

اسی کے ساتھ حضرت ایوبؑ، حضرت الیاس، حضرت زکریا علیہم السلام کے تذکرے اقبال کے کلام میں جابجا نظر آتے ہیں۔

حضرت عیسیٰؑ بہت نرم دل تھے اور خلقِ خدا پر رحم کرنے والے تھے حضرت عیسیٰؑ کے معجزات کا ذکر قرآن پاک میں وضاحت سے ملتا ہے۔ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ وہ اللہ کے حکم سے مردہ کو زندہ کرتے تھے وہ مادرزاد نابینا اندھے کو بینا اور کوڑھی کو اچھا کر دیتے تھے، وہ مٹی کا پرندہ بنا کر پھونک مارتے تھے تو اللہ کے حکم سے اس میں روح پڑ جاتی تھی۔ ۳۳

اقبال کے اس شعر میں مُردوں کو زندہ کرنے کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

قُمْ بِاِذْنِ اللّٰہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گور کُن ۳۴

اقبال کی نظر میں تمام نوع انسانی کے لئے نبی آخر الزماں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کے ساتھ ساتھ آپؐ کی شخصی وعمرانی حاصلات ہمیشہ مشعل راہ ہیں، آپؐ کی تعلیمات کی تعمیل ہی انسان کی فوز وفلاح کا ذریعہ ہے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

وہ دانائے سُبل ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغ وادی سینا ۳۵

جس دور میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کا نعرہ بلند کیا وہ انسانی جاہلیت کا تاریک ترین دور تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس کلمہ نے جاہلیت میں انقلاب برپا کر دیا تاریخ کے کسی بھی دور میں انسان اسے سننے سے محروم نہیں رہا۔ ۳۶ بقول اقبال ؎

یہ نغمہ فصل گل ولالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں، لا الٰہ الا اللہ ۳۷

انبیاء کرام ہی اللہ کی معرفت کے حصول کا وسیلہ اور اس کی مرضی واحکام جاننے کا ذریعہ ہیں اور انہیں کی تعلیماتی رہنمائی دنیا وآخرت میں کامیابی کا وسیلہ ہے اور مخلوق سے خالق کا صحیح

Scanned with CamScanner

تعارف بھی انہیں کی بدولت ممکن ہوا۔ اقبال نے اپنے کلام میں انبیاء کرام کی تعلیمات و سیرت کو عام کرنے کے لئے تلمیحات کا سہارا لیا خصوصاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو اور آپ کی تعلیمات پر اپنے فکر کی بنیاد رکھی۔ جو تعلیمات تعمیر شخصیت کے لئے ہر دور میں مشعل راہ رہیں گی۔

حوالہ جات:

۱۔ سورہ المومن، ۴۰، آیت ۷۸ (ترجمہ اشرف علی تھانویؒ

۲۔ سورہ البقرہ، ۲، آیت ۳۰

۳۔ کلیاتِ اقبال اردو، ضرب کلیم، ص ۲۴ (ناشر کتب خانہ حمیدیہ، گڑھیا اسٹریٹ جامع مسجد، دہلی)

۴۔ زیب النساء سرویا، کلام اقبال میں انبیاء اکرام کا تذکرہ، اریب پبلیکیشنز نئی دہلی ۲۰۱۴ء

۵۔ سورہ نوح، ۷۱، آیت ۲۶، ۲۷

۶۔ سورہ ھود، ۱۱، آیت ۳۷

۷۔ نوادر اقبال بحوالہ زیب النساء سرویا، ص۔ ۱۳۷

۸۔ ایضاً، ص۔ ۱۵۰

۹۔ سورہ الانبیاء، ۲۱، آیت ۶۸۔۷۰

۱۰۔ کلیات اقبال، بانگ درا، ص۔ ۱۹۷

۱۱۔ ایضاً، ص۔ ۱۵۶

۱۲۔ زیب النساء سرویا، ص۔ ۱۷۲

۱۳۔ سورہ مریم، ۱۹، آیت ۵۴۔

۱۴۔ سورۃ ابراھیم، ۱۴، آیت ۳۷

۱۵۔ کلیات اقبال، بال جبریل، ص۔ ۱۰

۱۶۔ ایضاً، ص۔ ۵۱

Scanned with CamScanner

۱۷۔ زیب النساء سرویا، ص۔۱۹۵

۱۸۔ سورہ یوسف، ۱۲، آیت ۱۸

۱۹۔ کلیات اقبال، بال جبریل، ص۔۵۲

۲۰۔ سورہ یوسف ۱۲، آیت ۹۶

۲۱۔ باقیات اقبال، بحوالہ زیب النساء سرویا، ص۔۲۰۱

۲۲۔ زیبالنساء سرویا، ص۔۲۲۹

۲۳۔ کلیات اقبال، بالِ جبریل، ص۔۷۰

۲۴۔ سورہ طٰہٰ، ۲۰۔آیت ۳۹

۲۵۔ کلیات اقبال، ضرب کلیم، ص ۲۱

۲۶۔ سورہ الاعراف، ۷ آیت ۱۴۸

۲۷۔ کلیات اقبال، بانگ درا، ص ۲۰۰

۲۸۔ زیب النساء سرویا، ص۔۲۸۲

۲۹۔ سورہ ص، ۳۸۔آیت ۱۸۔۱۹

۳۰۔ کلیات اقبال، بال جبریل، ص ۳۱

۳۱۔ کلیات اقبال، بانگ درا، بحوالہ زیب النساء سرویا، ص۔۳۲۷

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۲۶

۳۳۔ سورہ المائدۃ، ۵، آیت ۱۱۰

۳۴۔ کلیات اقبال، بال جبریل، ص۔۱۳۰

۳۵۔ ایضاً، ص۔۱۹

۳۶۔ سرویا زیب النساء، کلام اقبال میں انبیاء کا تذکرہ، ص ۷۹

۳۷۔ کلیات اقبال، ضرب کلیم، ص ۱۰

Scanned with CamScanner

علامہ اقبال کے کلام میں عورت

انسانی تمدن کے سب سے مقدم اور سب سے زیادہ پیچیدہ مسئلے کا صحیح اور متوزان حل انسان کی فلاح وترقی پر منحصر ہے۔ جن کو حل کرنے میں قدیم ترین زمانہ سے لے کر آج تک دنیا کے حکماء وعقلاء پریشان وسرگرداں رہے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں مرد اور عورت کا تعلق کس طرح قائم کیا جائے کیونکہ یہی تعلق دراصل تمدن کا سنگِ بنیاد ہے۔ علامہ اقبال نے اس مسئلہ کو اپنے کلام کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ جدید اردو شاعری میں اقبال ایسے شاعر ہوئے ہیں جنہوں نے اردو شاعری کو مقصدی شاعری کے طرز پر پیش کیا ہے۔ اس دور میں حالی اور اقبال دو ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں غزلوں میں صنفی آلودگی، عریانیت اور سطحیت نہیں ملتی جو غزلوں کی روایت، رنگ وآہنگ کو شعوری طور پر ترک کر کے اس کے برخلاف عورت کے مقام و احترام اور اس کی حیثیتِ عرفی کو بحال کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ حالؔی نے عورت کو محبوبہ اور بازاری پھندے سے آزاد کرا کے ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کی اہمیت کا علم کرایا اور اقبال نے اس صنف نازک کے مقام واحترام کو ملحوظ نظر رکھ کر اس کی اہمیت وافادیت کو برقرار رکھنے کے لئے قلم کا زور ہی نہیں دکھایا بلکہ خواب غفلت میں پڑی قوم کو اس کی عظمت رفتہ کا احساس بھی دلایا۔ دانائے راز کے فکر وفن میں عورت کو جو منصب، مقام ومنزلت عطا ہوئی وہ ان کی تحریروں، کلام اور ان کے خطبات سے ظاہر ہوتی ہے۔ عورت کے سلسلے میں اقبال کا نظریہ بالکل اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے وہ عورت کے لئے وہی طرز حیات پسند کرتے ہیں جو صدرِ اسلام میں پایا جاتا ہے۔ اس لئے اقبال کہتے ہیں کہ عورت مروجہ برقعے کے بغیر بھی شرعی پردے کا اہتمام اور شرم وحیا اور عفت وعصمت کے پورے احساس کے ساتھ زندگی کی تمام سرگرمیوں میں پوری طرح حصہ لے سکتی ہے۔ طرابلس کی جنگ میں جب ان کو اس کا ایک نمونہ دیکھنے کو ملا یعنی عرب کی ایک لڑکی

ڈاکٹر شبانہ عزیز، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ فارسی، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج۔ الہ آباد

Scanned with CamScanner

فاطمہ بنتِ عبداللہ غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہوگئی۔ اقبال نے اس کا زوردار ماتم کیا اور اس واقعہ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اس لڑکی کے نام کو ہی اپنی نظم کا عنوان بنا کر لکھا جو بہت مشہور و معروف ہے اور اقبال اپنے اردو و فارسی کلام میں عورت کے متعلق اپنے زریں خیالات کا گلدستہ بارہا پیش کرتے ہیں۔ ''بانگِ درا'' میں فاطمہ بنت عبداللہ' والدہ مرحومہ کی یاد میں دو نظمیں اور اس کے علاوہ عورت کے موضوع سے متعلق تین رباعیاں موجود ہیں اور ضربِ کلیم میں عورت کے عنوان سے ایک پورا باب ملتا ہے۔ ''ارمغانِ حجاز'' میں دخترانِ ملّت کے عنوان سے آٹھ رباعیاں ملتی ہیں اور باقی کتابوں میں بھی مختلف موضوعات کے دوران مختلف اسالیب سے عورت کا تذکرہ ملتا ہے۔

مغرب میں عورت کی آزادی کا جو تصور ابھرتا ہے وہ افراط و تفریط کا شکار ہونے کے باعث بہت غیر متوازن ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طویل عرصہ تک دیگر معاشروں کی طرح مغرب میں بھی عورت کو کسی قسم کا کوئی معاشرتی حق حاصل نہیں تھا۔ اور اس کی حیثیت مرد کے غلام کی سی تھی۔ اسی ردعمل کے طور پر وہاں آزادی نسواں کی تحریک شروع ہوئی اور اس کی بنیاد مرد و عورت کی مساوات پر رکھی گئی مطلب یہ تھا کہ ہر معاملہ میں عورت کو مرد کے دوش بدوش لایا جائے۔ چنانچہ معاشرت، معیشت، سیاست اور زندگی کے ہر میدان میں عورت کو بھی وہ تمام حقوق حاصل ہوگئے جو مرد کو حاصل تھے۔ اس بات کو آزادی نسواں یا مساواتِ مرد اور عورت قرار دیا گیا۔ اس کا نتیجہ اس بے بنیاد آزادی کی صورت میں برآمد ہوا کہ عورت تمام فطری اور اخلاقی قیود سے بھی آزاد ہوگئی۔

اقبال کو ایسے تمام فن کاروں سے شکایت تھی جو عورت کے نام کا غلط استعمال کر کے ادب کی پاکیزگی بلندی اور مقصدیت کو صدمہ پہونچاتے ہیں وہ دخترانِ ملّت سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمان خاتون کے لئے دلبری اور بناؤ سنگار ایک معنیٰ میں گناہ ہے بلکہ انہیں تو اپنی شخصیت انقلابی فطرت اور پاکیزہ نگاہی سے باطل کی امیدوں پر پانی پھر دینا چاہئے۔

Scanned with CamScanner

بہل اے دخترک ایں دلبری ہا　　مسلماں را نہ زیبد کافری ہا
منہ دل بر جمال غازہ پرور　　بیاموز از نگہ غارت گری ہا

اقبال پر یہ اعتراض تجدید پسند حلقوں کی جانب سے اکثر کیا جاتا ہے کہ وہ عورت کو جدید معاشرہ میں اس کا صحیح مقام دینے کے حامی نہیں ہیں۔ جبکہ انہوں نے اس باب میں تنگ نظری اور تعصب سے کام لیا ہے اور آزادی نسواں کی مخالفت کی ہے یہ اعتراض وہ لوگ کرتے ہیں جو آزادی نسواں کے صرف مغربی تصور کو پیش نظر رکھتے ہیں اور ان نظریات کی بنیاد خالص اسلامی تعلیمات پر ہے۔ اس لئے وہ عورت کے بارے میں وہی کچھ کہتے ہیں جس کی تعلیم اسلام نے دی ہے چنانچہ اس سلسلہ میں اقبال کے خیالات کا جائزہ لینے سے پہلے آزادی نسواں کے مغربی تصور اور اسلامی تعلیمات کا مختصر تعارف لازم ہے۔

علامہ اقبال کا کہنا ہے کہ مسلمان عورت کو پردہ کے اہتمام کے ساتھ بھی معاشرہ اور زندگی میں اس طرح رہنا چاہئے کہ اس کے نیک اثرات معاشرہ پر مرتب ہوں اس کے پرتو سے حریم کائنات اس طرح روشن رہے جس طرح ذاتِ باری کی تجلّی حجاب کے باوجود کائنات پر پڑ رہی ہے۔

ضمیرِ عصر حاضر بے نقاب ست　　کشاوش در نمود رنگِ آب ست
جہاں تابی زنورِ حق بیاموز　　کہ اوبا صد تجلی در حجاب ست

اللہ تعالیٰ نے عورت کو ماں کا حق دیا۔ اسی لئے عورت کو محبت اور ایثار کا مادہ عطا فرمایا کیونکہ جب تک عورت میں یہ جذبات شدت کے ساتھ کارفرما نہ ہوں وہ بچوں کی پرورش کے لئے اپنے عیش کو قربان نہیں کر سکتی اس لئے اقبال دنیا کی سرگرمیوں کی حقیقت حال ماؤں کی ذات کو قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی ذات امین ممکنات اور انقلاب انگیز مضمرات کی حامل ہے۔ اور جو قومیں ماؤں کی قدر نہیں کرتیں ان کی زندگی کا نظام بے ترتیب ہو کر رہ جاتا ہے وہ درست نہیں ہو سکتا۔

جہاں را محکمی از اُمہات ست　　نہادِ شاں امینِ ممکنات ست
اگر این نکتہ را قومے نداند　　نظامِ کارو بارش بے ثبات ست

Scanned with CamScanner

اقبال اپنی تمام صلاحیتوں اور کارناموں کو اپنی والدہ محترمہ امام بی بی جنہیں احترام سے بی جی کہا جاتا تھا، ان کا فیض نظر بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آداب واخلاق تعلیم گاہوں سے نہیں ماؤں کی گود سے حاصل ہوتی ہے۔

مراداد ایں خرد پرور جنونے　　نگاہِ مادرِ پاک اندرونے
زمکتب چشم و دل نتواں گرفتن　　کہ مکتب نیست جز سحر فسونے

عورت جسے قدرت نے ماں بننے کے لئے پیدا کیا تھا ماں بننے سے انکار کرنے لگی اور اپنی آزادی میں رکاوٹ سمجھنے لگی۔ اقبال نے یہاں تک کہا کہ قوموں کی تاریخ اور ان کے ماضی وحال کو ان کی ماؤں کا فیض قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ماؤں کی پیشانیوں پر جو لکھا ہوتا ہے وہی اس قوم کی تقدیر ہوتی ہے۔

خنک آملتے کز دار دانش　　قیامت ہا بہ بیند کائناتش
چہ پیش اید چہ پیش افتاد اورا　　تواں دید از حسین امہاتش

اقبال تمام عورتوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ ملت کی تقدیر سازی کا کام کریں اور ملت کی شامِ الم کو صبح بہار سے بدل دیں، اور وہ اس طرح کہ گھروں میں قرآن کا فیض عام کریں جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ نے اپنی قرآن خوانی سے ان کی تقدیر بدل دی اور اپنے لحن ولہجہ کے سوز وساز سے ان کے دل کو گداز کر دیا تھا۔

زشام مابروں آور سحر را　　بہ قرآن باز خواں اہل نظر را
تومی دانی کہ سوزِ قرائت تو　　دگرگوں کرد تقدیرِ عمرؓ را

کیونکہ خاندانی نظام میں جذبۂ امومت اصل کا حکم رکھتا ہے اور اسی کے فیض سے نسل انسانیت کا چمن ہرا بھرا اور لہلہاتا رہتا ہے۔ جس طرح سے گھر سے باہر کی زندگی میں مرد کو فوقیت حاصل ہے اسی طرح گھر کے اندر کی سرگرمیوں میں عورت کو اور خاص طور سے ماؤں کی بہت اہمیت ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان ماؤں کے ذمہ نئی نسل کی داشت و پرداخت اور دیکھ بھال ہوتی ہے۔

Scanned with CamScanner

انسان کا پہلا مدرسہ ماں کی گود ہوتی ہے ماں جتنی مہذب، شائستہ اور بلند خیال ہوگی بچے پر بھی تیزی سے اثرات مرتب ہوں گے اور ایک اچھی اور قابل فخر نسل ترتیب پا سکے گی۔

اقبال کی نظر میں جو قومیں حق مادری کے آداب نہیں بجالاتیں تو ان کا نظام ناپائیدار اور بے اساس ہوتا ہے، اور خاندانی امن وسکون درہم برہم ہو جاتا ہے۔ افرادِ خاندان کا باہمی اتحاد واعتماد ختم ہو جاتا ہے۔ چھوٹے بڑے کی تمیز اٹھ جاتی ہے اور بالآخر اقدار عالیہ اور اخلاقی خوبیاں دم توڑ دیتی ہیں۔ ان کے خیال میں مغرب کا اخلاقی بحران اسی لئے رونما ہوا ہے کہ وہاں ماں کا احترام اور صنفی پاکیزگی ختم ہوگئی ہے۔

وہ آزادی نسواں کی تحریک کے اسی لئے حامی نہیں کہ اس کا نتیجہ دوسرے انداز میں عورتوں کی غلامی ہے۔ اس سے انکی مشکلات آسان نہیں اور پیچیدہ ہو جائیں گی اور انسانیت سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ جذبۂ امومت ختم ہو جائے گا۔ ماں کی محبت کی روایت کمزور ہو جائے گی اسی لئے اقبال کا کہنا ہے کہ جس علم سے عورت اپنی خصوصیت کھو دے وہ علم نہیں بلکہ موت ہے اور فرنگی تہذیب قوموں کو اسی موت کی دعوت دے رہی ہے ؎

علم او بار امومت بر نتافت　　بر بہر شاخش یکے اختر شافت
ایں گل از بستانِ مانا رستہ بہ　　داغش نہ دامانِ ملت شستہ بہ

اقبال کے خیال میں آزادی نسواں ہو یا آزادی رجال یہ دونوں کوئی معنیٰ نہیں رکھتے بلکہ مرد اور عورت کا ربط باہمی ایثار اور تعاون۔ ایک دوسرے سے عدم تعاون کے سبب زندگی کا کام درمیان میں رہ جائے گا اور اس کی چمک دمک ماند و پھیکی پڑ جائے گی آخر کار یہ نوعِ انسانی کا بڑا نقصان ہوگا ؎

مرد و زن وابستۂ یک دیگر اند　　کائنات شوق را صورت گراند
زن نگہ دارندۂ نارِ حیات　　فطرتِ او لوحِ اسرار حیات
آتشِ مارا بجان خود زند　　جوہر او خاک را آدم کند

Scanned with CamScanner

ارج ما از ارجمندی ہائے او　　باہمہ از نقشبندی ہائے او

اقبال فرماتے ہیں کہ اگر عورت علم وادب میں مہارت نہ رکھتی ہو اور نہ کوئی بڑی خدمت انجام دے سکے پھر بھی فقط اس کی محبت ہی قابل قدر ہے۔ جس کے طفیل مشاہیر عالم پروان چڑھتے ہیں اور دنیا کا کوئی انسان نہیں جو اس کی محبت کا ممنون احسان نہ ہو۔

اقبالؔ نے بڑی خوبی کے ساتھ آزادیِ نسواں کے مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار کیا یعنی در پردہ پردہ کی حمایت بھی کر دی اور بظاہر کچھ نہیں کیا کیونکہ آزادی نسواں کی تحریک مرد اور عورت کا رشتہ جس طرح جدا ہوا اس کے جو برے نتائج سامنے آئے اقبال مغربی تہذیب کو ذمہ دار مانتے ہیں کیونکہ مغرب کے مقلدین کور یعنی فیشن پرست تو مجھ سے پہلے ہی ناراض ہیں مصلحتاً خاموش ہوں۔ ''مردِ فرنگ'' کے عنوان سے ''ضرب کلیم'' کے حصہ سوم میں اقبال اس طرح کہتے ہیں کہ

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا
مگر یہ مسئلہ زن رہا وہیں کا وہیں
قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

عورت کا مسئلہ ہمارے زمانے میں بہت پیچیدہ صورت اختیار کر چکا ہے اور یہ پیچیدگی مغربی تہذیب کی پیدا کردہ ہے، غلط تعلیم نے عورت کے دل میں یہ غلط خیال جاگزیں کر دیا ہے کہ مرد اور عورت میں کامل مساوات ہے اور عورت کسی اعتبار سے بھی مرد کی محتاج یا دست نگر نہیں ہے اگر دنیا قرآن مجید کے اصول اختیار کرے تو عورت کا مسئلہ بآسانی حل ہو سکتا ہے۔ مرد اور عورت دونوں یکساں ہیں جو اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔

علامہ اقبال کے ان منتخب اشعار کے بحیثیت مجموعی مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ

Scanned with CamScanner

علامہ کے نزدیک شرعی پردے کا اہتمام مسلمان خاتون کے لئے از حد ضروری ہے اور اسی پردے کے باعث عورت یکسو ہو کر اپنی صلاحیتوں کو اپنے گھر اور خاندان کی تعمیر میں لگا کر بہتر کارگزاری کر سکتی ہے۔ تاہم ضرورت کے تحت پردے کے اہتمام کے ساتھ ساتھ وہ زندگی کی تمام سرگرمیوں میں حصہ لے سکتی ہے۔ اس ضمن میں فاطمہ (طرابلس کی مجاہدہ) علامہ کے نزدیک ایک مثالی کردار ہے۔ نیز ان اشعار کے مطالعہ سے یہ بات مبرہن ہو کر سامنے آتی ہے کہ علامہ کے نزدیک عورت کی مقدس ترین حیثیت وہ ہے جو ماں اور مامتا کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اسی لئے علامہ معاشرتی اور عائلی زندگی میں ماں کے مقام کو مرکزی مقام قرار دیتے ہیں۔

اقبال کا ایک اہم نکتہ ''پردہ'' خاص طور سے عورت کے لئے سمجھا جاتا ہے یعنی ہم سمجھتے ہیں کہ عورت صرف پردہ کرتی ہے پردے کے سلسلہ میں اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ وہ پردے کی حمایت کرتے ہیں کہ پردہ عورت کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں وہ پردے میں رہ کر تمام جائز سرگرمیوں میں حصہ لے سکتی ہے اور اپنے فرائض کی انجام دہی کر سکتی ہے۔ کیونکہ خالقِ کائنات پس پردہ ہی کارگاہِ عالم کو چلا رہا ہے۔ اس کی ذات تو حجاب قدس میں ہے، لیکن اس کی صفات کی پرچھائیاں بحر و بر پر پھیلی ہوئی ہیں۔ اقبال عورت کو خطاب کرتے ہیں کہ ؎

جہاں تابی زنورِ حق بیاموز
کہ اوبا صد تجلی در حجاب است

اقبال ان سبھی لوگوں کے جو پردہ کے خلاف ہیں جواب میں کہتے ہیں کہ پردہ جسم کا حجاب ہے لیکن اس عورت کی بلند صفات اور پنہاں امکانات کے لئے رکاوٹ کیسے کہا جا سکتا ہے اصل سوال یہ نہیں ہے کہ چہرے پر پردہ ہو یا نہ بلکہ یہ ہے کہ شخصیت اور حقیقت کی ذات پر پردے نہ پڑے ہوں اور انسان کی خودی بیدار اور آشکار ہو چکی ہو۔

''خلوت'' کے عنوان سے ایک نظم ''ضرب کلیم'' کے حصہ سوم میں ہے جس میں اقبال نے پردہ کے فوائد بیان کئے ہیں جس طرح آبِ نیساں گوہر بنتا ہے جو صدف کے آغوش میں پنہاں ہو

Scanned with CamScanner

جاتا ہے کیونکہ جب اس قطرہ کو خلوت نصیب ہوتی ہے اور پردہ کر لیتا ہے تو وہ موتی بن جاتا ہے۔ اس طرح خودی خلوت میں مستحکم ہوتی ہے اور پردہ کی وجہ سے عورت کو یکسو ہو کر اپنی صلاحیتوں کو نسلوں کی تربیت پر صرف کرنے اور اپنی ذات کے امکانات کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے سماجی خرابیوں سے الگ رہ کر اپنے گھر اور خاندان کی تعمیر کا سامان میسر آتا ہے گھر کے پرسکون ماحول کے اندر اسے زندگی کے مسائل اور معاشرتی موضوعات کو سوچنے سمجھنے کی آسانیاں ملتی ہیں اور اس طرح وہ اپنے اور دوسروں کے لئے بہتر کارگزاری کر سکتی ہے۔

ایک بڑا معاشرتی مسئلہ یہ رہا ہے کہ مرد اور عورت کے تعلق میں بالادستی کسے حاصل ہو؟ اس لئے کہ دنیا کا کوئی بھی تعلق ہو اس میں کوئی ایک فریق شریک غالب کی حیثیت ضرور رکھتا ہے اور یہ اس کائناتی حقیقت پر مبنی ہے کہ ہر شے اور ہر انسان ایک دوسرے کا محتاج ہے اور ہر ایک دوسرے کی تکمیل کرتا ہے۔ خاص طور سے مرد اور عورت کے تعلقات میں چند چیزوں میں مرد کو عورت پر فضیلت اور اوّلیت حاصل ہے اور یہ بھی کسی نسلی اور صنفی تفریق کی بنا پر نہیں بلکہ خود عورت کے حیاتیاتی، عضویاتی فرق اور فطرت کے لحاظ کے ساتھ اس کے حقوق و مصالح کی رعایت کے پیش نظر ہے۔ ''نگرانی'' اور ''قوّامیت'' ایسی نہیں جو مرد اور عورت دونوں کے حوالے کر دی جائے یا صرف مرد کو دی جائے یا صرف عورت کو دی جائے اقبال نے مغرب کی نام و نہاد'' آزادی نسواں'' کی پروا کئے بغیر عورت کے بارے میں اسلامی تعلیمات کی پرزور وکالت کی اور عورت کی حفاظت کے لئے مردوں کو تائید کیا۔ اس کے ساتھ اقبال اس حدیث کا بھی حوالہ دیتے ہیں کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّهَاتِ' یعنی جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے، انہوں نے امومت کو رحمت کہا ہے اور اسے نبوّت سے تشبیہ دی ہے۔ ماں کی شفقت کو وہ پیغمبر کی شفقت کے قریب کہتے ہیں، اس لئے کہ اس سے بھی اقدام کی سیرت سازی ہوتی ہے اور ایک ملت وجود میں آتی ہے۔ جب ہم فرائض کی بجا آوری کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں مرد اور عورت دونوں کے فرائض میں نمایاں فرق نظر آتا ہے قدرت نے مرد کو ایسی قوتیں عطا

Scanned with CamScanner

کی ہیں جن کے ذریعہ وہ بآسانی فکر معاش کا فریضہ انجام دیتا ہے اور اس نے عورت کو بھی ایسی طاقتیں ودیعت کی ہیں جن کے ذریعہ وہ تمام تدبیر منزل کے فریضہ کا حق ادا کرتی ہے۔ جب تک مرد اور عورت اپنے اپنے فرائض دیانت داری سے ادا کرتے ہیں تو انسانی معاشرت کے دونوں حصے یعنی مرد اور عورت میں حسن معاشرت اور انسانی قدریں ارتقاء پذیر رہتی ہیں لیکن جب مرد اور عورت دیانت داری برقرار نہیں رکھتے تو دونوں ایک دوسرے سے فرار کی راہ تلاش کرنے میں اپنا سکون سمجھتے ہیں۔

اقبال نے عمرانیات کا ایک زبردست نکتہ بیان کیا ہے جس کی اہمیت نہ پہچاننے کی وجہ سے یورپ کا معاشرتی نظام تہ و بالا ہو چکا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کو فطری طور پر کمزور بنایا ہے وہ اپنی اور اپنی عصمت کے لئے محتاج مرد ہے۔ رضیہ سلطانہ، چاند بی بی اور رانی لکشمی نے گھوڑے پر سوار ہو کر میدان جنگ میں دشمنوں کا مقابلہ اور فوجوں کی رہنمائی کی لیکن اس کے باوجود تینوں مرد کی حمایت اور حفاظت کے بغیر زندگی بسر نہ کر سکیں اس کی وجہ یہ تینوں کی زندگی میں شوہر کی کمی تھی۔ ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا اور نہ ہی اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کیا کہ انہیں شوہر یا مرد کی ضرورت نہیں ہے۔ عورت گھوڑے پر سوار ہو کر تلوار چلا سکتی ہے بلکہ تخت سلطنت پر بیٹھ کر حکومت بھی کر سکتی ہے لیکن اپنی نسوانیت کی حفاظت نہیں کر سکتی اس کی حقیقت یہ ہے کہ عورت کی حفاظت نہ پردہ سے ہو سکتی ہے نہ تعلیم قدیم سے نہ تعلیم جدید سے، صرف مرد ہی اس کی نسوانیت کی حفاظت کر سکتا ہے۔

اقبال عورت کو کس قدر عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ساتھ ہی بے پردگی اور بے حیائی کے سخت خلاف تھے انھوں نے کہا کہ اس کی مشت خاک پاکیزگی اور شرافت میں ثریا سے بھی بلند پائی جاتی ہے اس کا منبع عورت کی ذات ہے۔ حضرت فاطمہؓ کو ملت اسلامیہ کی ماؤں کے لئے مثالی خاتون سمجھتے ہیں اور جگہ جگہ ان کی اتباع کی تاکید کرتے ہیں کہ وہ کس طرح چکی پیستے ہوئے بھی قرآن پڑھتی رہتی تھیں اور گھریلو کاموں میں مشکیزہ تک اٹھانے پر صبر فرماتی تھیں۔ اقبال کے خیال

Scanned with CamScanner

میں سیرت کی اس پختگی سے حضرت حسینؓ ان کی آغوش سے نکلے۔

مرزعِ تسلیم را حاصل بتولؓ　　مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ
آں ادب پروردۂ صبر ورضا　　آسیا گرداں ولب قرآں سرا
فطرتِ تو جذبہ ہا دارد بلند　　چشمِ ہوش از اسوۂ ہراؓ بلند
تا حسینےؓ شاخِ تو بار آورد　　موسم پیش یہ گلزار آورد!

اقبال کے کلام کی پہلو داری اور ہمہ جہتی کا زمانہ قائل ہے۔ اس طرح ان کے افکار ونظریات میں بھی بڑی رنگا رنگی ہے۔ ان خیالات سے ہر شخص کا صد فی صد متفق الرائے ہونا ضروری نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی مناسب نہیں ہے کہ اقبال کی شاعری یا ان کے جن افکار سے ہمیں اتفاق نہ ہو ان کو بالکل رد کر دیں یا پھر انہیں اپنی پسند کے مطابق ڈھالنے کے لئے غلط تاویلیں اور دور از کار دلیلیں پیش کرنے لگیں۔ مثلاً مذہب اور سیاست کی وحدت پر علامہ کا اصرار، جمہوریت قوم اور وطن کے بارے میں عام مروجہ نظریات سے بالکل مختلف، ان کا تعلیم نسواں سے متعلق اقبال کا منفرد تصور اگر عہدِ حاضر کے بعض ناقدین کی ذاتی پسند اور معیارات کا ساتھ نہیں دیتے تو ان سے اقبال کے کلام اور افکار کی اہمیت وافادیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ علامہ اقبال ابتدائی طور پر برصغیر پاک وہند میں ایک ادبی شخصیت کے طور پر معروف ہوئے لیکن بعد میں ان کی بے مثال سیاسی بصیرت اور نظریات نے انہیں بے حد شہرت دی۔ ان کی شاعری اسلام اور مسلمانوں کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ جس نے دنیا کے مسلمانوں کو بالعموم اور برصغیر کے مسلمانوں کو بالخصوص خواب غفلت سے بیدار کیا اور تمام مسلمان عورتوں کو وصیت کرتے ہیں کہ۔

اگر پندے ز درویشے پذیری　　ہزار امت بمیرد تو نمیری
بتولےؓ باش وپنہاں شو ازیں عصر　　کہ در آغوش شبیرےؓ بگیری!

مختصراً یہ کہ جو قومیں اخلاق سے عاری ہوں اسلام کے اقدار سے بیگانہ ہوں وہاں عورت کو عزت نفس کو ضمانت فراہم کی جاسکتی ہے۔ ایسی قوم اور ایسے حاکموں کے قلمرو میں خواتین

Scanned with CamScanner

اور عفت مآب مستورات کے تحفظ کی توقع کی جاسکتی ہے اس کا جواب نہیں میں ہوگا۔ اس کا ایک ہی حل ہے صرف اور صرف ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ اسلام کی پاک وصاف شاہراہ حیات اپنائیں۔ علامہ اقبال نے ہماری انگلی پکڑ کر اپنے کلام، تحریروں اور خطبات کے ذریعہ اس جانب رہنمائی کی ہے۔

کتابیات :

۱۔ کلیات اقبال (اردو)، علامہ اقبال، علی گڑھ ۱۹۸۶ء

۲۔ کلیات اقبال (فارسی)، علامہ اقبال، دہلی ۱۹۷۱ء

۳۔ نقوش اقبال، مولانا ابوالحسن علی ندوی، لکھنؤ ۲۰۰۷ء

۴۔ پردہ، مولانا سید ابوالعلیم مودودی، نئی دہلی ۲۰۱۳ء

۵۔ اقبال کا خطبہ، ڈاکٹر آصف اعوان، نئی دہلی ۲۰۱۲ء

۶۔ شرح ضرب کلیم، چشتی یوسف سلیم، نئی دہلی ۱۹۷۴ء

۷۔ شرح ارمغان حجاز، چشتی یوسف سلیم، نئی دہلی ۱۹۷۴ء

Scanned with CamScanner

تہذیبوں کا زوال: ایک تلخ حقیقت

مشرف عالم ذوقی کا ناول ''لے سانس بھی آہستہ'' موجودہ دور کا مشہور ناول ہے۔ اس ناول کا موضوع جنگ آزادی کے وقت مسلمانوں کی تاریخ اور زمیں دارانہ نظام کا زوال ہے۔ ایسی دنیا جہاں ہر سانس ایک نئی عبارت خلق کر رہی ہے رفتہ رفتہ اس تیز رفتار زندگی نے تہذیبوں کو بھی مٹا دیا ہے۔ تہذیبی نزاکتیں کہیں کھو گئی ہیں۔ یہ رشتوں کو کمزور کر رہی ہے۔ نئی تہذیب کے ساتھ ہی مذہب سے دور ہو رہے افراد اخلاقیات سے بھی دور ہو رہے ہیں۔ انسان کو تو اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل ہے تو وہ اتنا خود کو کیوں گرا رہا ہے کہ انسان اور جانور کا فرق ختم ہو جائے جہاں نہ رشتوں کی کوئی اہمیت ہوتی ہے نہ ہی وہ ان کے لئے مقدس ہوتے ہیں۔ جہاں نہ احساسات کوئی معنی رکھتے ہیں نہ ہی رشتوں کا بکھرنا۔ انسان اس سماج میں رہ کر خود کو انسانی فرد کہلانے کا مطالبہ کرتا ہے پر کیا وہ خود کے اندر پل رہے جانور کو ختم کر پاتا ہے یا پھر سماجی جانور سے جانور بننے میں اس کو دیر نہیں لگتی۔ بقول ذوقی۔

> ''انسان ایک سماجی جانور ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے سماج کی شناخت کرتا ہے مگر اس جانور کو کچھ لمحے کے لیے بھول جاتا ہے، جو اب نصاب کی کتابوں سے نکل اس کے جسم میں پرورش پا رہا ہے۔ وقفے وقفے سے وہ جانور اس کے اندر سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر ہر بار سماجیات کے ریشمی غلاف میں وہ اس جانور کو چھپا لیتا ہے۔''

ناول کی ابتدا سرد پہاڑی موسم سے ہوتی ہے۔ جس میں ضعیفی کی علامت کا ذکر

فرح ہاشم، گیسٹ فیکلٹی، بی ووک جرنلزم اینڈ ماس کمیونیکیشن، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج الہ آباد

Scanned with CamScanner

ہوا ہے۔ میز پر رکھے ہوئے ایک خط کو دیکھ کر عبدالرحمٰن ایک عجیب سی کشمکش میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ وہ خط اس کو پرانی یادوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ جس کا سب سے اہم کردار تھا نور محمد۔ جس کو خدا نے ایک امتحان کے لئے انتخاب کیا تھا۔ نور محمد کی کہانی اخلاقیات پر آکر منجمد ہو جاتی ہے۔ عبدالرحمٰن ان خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ اسی وقت اس کی ۱۷ سال کی پوتی سارہ آکر اسے چونکا دیتی ہے۔ وہ سارہ کو جائز اور ناجائز کا فرق بتاتے ہیں۔ جس طرح دہشت گردی ایک ملک کے لئے ناجائز ہے مگر جس ملک نے بھیجا ہے انکے لئے جائز۔ اسی طرح ایک ملک کا فوجی اپنے ملک کے لئے وفادار دوسرے ملک کے لئے دشمن۔ معاشرہ بدل رہا ہے ساتھ ہی نئی اخلاقیات سامنے آرہی ہے۔ ایسے ایسے واقعے سامنے ہیں جس کو دیکھ کر یا سن کر حیرت ہوتی ہے۔ بقول مصنف ۔

''سماجی آئین سے الگ کی ایک نئی اخلاقیات سامنے آرہی تھی... انسانوں سے لے کر جنگلی جانوروں تک نئی اخلاقیات کی ہزاروں مثالیں سامنے تھیں آسٹریلیا کے حوالے سے ایک خبر آئی تھی کہ ایک شیرنی ایک چھوٹی سی بلّی کی محافظ بن گئی ہے۔ انگلینڈ کے ایک جنگل میں کتے اور بھالو کو ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھ کر ایک فوٹو گرافر نے اپنے کیمرے میں قید کیا تھا۔ دنیا کے سب سے چھوٹے ماں باپ ۱۵ سال کے بچے تھے۔ ٹی وی کے روشن اسکرین پر دو چھوٹے بچے اپنے چھوٹے سے ننھے بچے کو دیکھتے ہوئے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ بدلتا ہوا نظام، گلیشیر کے پگھلنے اور سائبیریا میں گھاس اگنے تک خبروں نے بدلتے ہوئے موسم کی گواہی دے ڈالی ہے۔''

Scanned with CamScanner

نئی تکنیک، گلوبل وارمنگ جس نے موسم کے حال کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ بارش کے دنوں میں بارش نہیں ہوتی سرد موسم میں گرمی دستک دیتی ہے۔ گلوبل وارمنگ کے سبب سب کچھ بدلتا جا رہا ہے۔

ماضی کی کچھ یادیں اس خط کے روپ میں عبدالرحمٰن کی نظر کے سامنے تھیں جس کے سبب اس کو کھولنے میں کچھ وقت لگ گیا خط کا ایک جملہ دھماکہ بن کر اسکے کانوں میں گونجنے لگا۔

''اس کہانی کی شروعات آپنے کی تھی انجام بھی آپ لکھیں گے۔''

ابو بابا اور ان کی بیوی حلیمہ دونوں گھر کے پرانے خادم تھے جو گھر کے کام کاج کے ساتھ باغبانی کی ذمہ داری بھی سنبھالتے تھے۔ اس کہانی نے اپنے ننھے ننھے ہاتھ پاؤں کھول دئے تھے۔ کیا مجھے نور محمد کے پاس جانا چاہئے جیسے سوال ذہن میں گونج رہے تھے۔ پھر یہ ناول دس سال کے خوفناک واقعات سناتا ہے۔ جس میں اس کہانی کے اندر دوسری کہانی iron in the soul کو وابستہ کیا۔ جس میں ماضی اور حال کی داستان سنائی دیتی ہے۔ معاشرتی پریشانیوں کا ذکر کیا ہے جس میں آج ہر انسان الجھ کر رہ گیا ہے۔ حال میں ہو رہی تبدیلیوں کا مصنف نے ذکر کیا ہے :

''ساری دنیا میں بھوک مری اور غریبی لوٹ آئی۔ تیل کی قیمتیں
آسمان چھو گئیں شیئر بازار لڑھک کر گر پڑا ہزاروں بینکوں کو دیوالیہ
قرار دے دیا گیا ابوظہبی دبئی جیسے جدید مراکز ہل گئے۔ امریکی
کرنسی گریٹ ڈپریشن کا شکار ہوئی۔ ماحولیات کے تحفظ کے لئے
نئے نئے ماڈل بنائے گئے۔ سر جوڑتے ہوئے دنیا کے تمام بڑے
سائنسدانوں نے فیصلہ سنایا۔ 'انسانی ترقی اور کامیابی کی کہانیاں
ہی دراصل انسانی بربادی کی بھی اصل وجہ ہیں۔''

دوسرے باب میں پروفیسر نیلے کا کردار آتا ہے۔ جو عبدالرحمٰن کے پڑوسی

Scanned with CamScanner

تھے۔ جن سے تہذیب کی گفتگو کے دوران نور محمد کا معصوم چہرہ سامنے آتا ہے۔ ''تہذیب مرنے کے لئے ہوتی ہے ایک تہذیب جہاں ختم ہوتی ہے۔ دوسری تہذیب وہیں سانس لینا شروع کر دیتی ہے۔''

اگلے حصے میں جنگ آزادی کا جشن منایا گیا ہے۔ بلند شہر کی بلند حویلی میں جشن کا اہتمام کیا گیا تھا۔ آزادی کا یہ احساس مسرت آمیز تھا۔ لیکن آزادی اپنے ساتھ کئی طرح کے مسائل لے کر آئی تھی۔ عوام کو یہ سمجھنے میں دشواری تھی کہ کون سا حصہ پاکستان کا ہے کون سا حصہ ہندوستان کا نئی آزادی اپنے ساتھ نفرتوں کا غبار لے کر آئی تھی ہندو مسلمانوں سے ناراض تھے۔ کچھ وطن پرست مسلمان پاکستان جانے کو تیار نہ تھے کیوں کہ ان کا ملک تو ہندوستان تھا۔ محض مذہب کی بنیاد پر کوئی کسی کا وطن کیسے چھین سکتا ہے۔ میرا وطن تو ہندوستان ہے اس کو تقسیم کیسے کیا جا سا کتا ہے۔ آزادی کی قیمت ملک کی تقسیم کی شکل میں چکانی پڑی۔ اسی بیچ نظر محمد کا کردار سامنے آتا ہے۔ جو ملک کی تقسیم کے لئے گاندھی جی کو ذمہ دار مانتا ہے۔ پر گاندھی جی نے تو ایک نئی اخلاقیات کو سامنے رکھا 'تم کچھ بھی کرو ہم خاموش رہیں گے'۔ اس عمل کے سبب حکومت اچانک خوفزدہ ہوگئی تھی۔

آزادی کے بعد جہاں ایک طرف عوام کھلی فضا میں سانس لے رہی تھی۔ وہیں جاگیردارانہ نظام کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ زوال کی طرف راغب ہو رہے تھے۔ وہ اپنی شان کھو کر کہیں کام یا نوکری نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جہاں ان کی حویلی میں نوکروں کی لائن لگی رہتی تھی وہ خود کہیں جا کر کام کرتے یہ ان کی شان کے خلاف تھا۔ آزادی کے بعد ایک نئی تبدیلی ہوئی زمیں دار کے بچے دکاندار بن رہے تھے۔ آہستہ آہستہ حویلیوں پر براوقت آنے لگا۔ حویلیاں بھی ملک کی طرح تقسیم ہو رہی تھیں۔ آدھے حصے میں دکانیں ہاسٹل، ہوٹل تعمیر ہو رہے تھے۔ سوچ بدل رہی تھی۔

''میں نے ہوش سنبھالا تو بلند شہر کی اس بلند حویلی کے در و یوار

Scanned with CamScanner

پوری طرح اپنی آن بان شان کھو چکے تھے مگر کسی طرح اس شان
کو قائم رکھنے کی کوشش کی جارہی تھی ۔نوکر چاکروں کی فوج ہٹا
دی گئی تھی ۔ باہر جو جگہ ان کے رہنے کے لئے دی گئی تھی، اس
جگہ تین چار دکانیں نکل آئیں ۔ دکانیں اس طرح نکالی گئیں کہ
حویلی کے مین دروازے سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اور کوئی یہ
نہ کہ سکے کہ کاردار خاندان اب ان دکانوں کے کرائے کے
بھروسے زندہ ہے۔ پانی بھرنے والے پرانے خادم عبدل بھشتی
کو بھی جواب دے دیا گیا۔ اب لے دے کر ایک خانساما تھا،
ایک مریم بوا تھیں اور حویلی کی عزت و ناموس کو بچائے رکھنے کی
ذمہ داری ابا حضور کے ناتواں کندھے پر تھی۔''

حویلی میں مولوی محفوظ کی آمد ہوتی ہے ۔ان کا کہنا تھا کہ بلند حویلی کی تقدیر بدلنے والی ہے۔ میری آنکھیں وہ منظر دیکھ رہی ہیں جو آپ سوچ بھی نہیں سکتے ۔ مولوی صاحب کہتے جیسے کوئی وید یا حکیم بغیر نبض دیکھے مرض کی تشخیص کر لیتا ہے۔ اسی طرح ہماری آنکھیں گمشدہ خزانے تلاش لیتی ہیں ۔ گمشدہ خزانہ جو حویلی کی صحن میں تھا۔ مولوی کی یہ بات اس حویلی کی پست آنکھوں میں نئی چمک لے آتی ہے ۔ کھدائی کا کام شروع ہوتا ہے۔ رحمٰن حویلی میں ہو رہی ان تبدیلیوں کو اپنے دوست نور محمد کو بتانا چاہتا ہے۔ اسی ماحول میں پھٹا ہوا لفافہ پاکستان سے آتا ہے ۔ جس میں ماموں کی اہلیہ کے انتقال کی خبر لکھی تھی۔ ملک کی تقسیم کے سبب وہ لوگ پاکستان چلے گئے تھے۔ ان کے اس غم میں کوئی شریک بھی نہیں ہو سکا ساتھ ہی ایک چھوٹی بچی نادرہ کو وہ چھوڑ گئی تھیں ۔

شہر کی فضا خراب تھی چاروں طرف ہندو مسلم فساد پھیلا ہوا تھا۔ ایسے ہی وقت سفیان ماموں کی دستک اور نادرہ کا آنا نادرہ کے آنے سے سب سے زیادہ جس کو خوشی

Scanned with CamScanner

تھی وہ رحمٰن تھا۔ حویلی میں چل رہی کھدائی کی خبر آگ کی طرح چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ پولیس بھی تفتیش کے لئے حویلی پہنچتی ہے پر خزانہ کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ پولیس کے آنے پر کاردار کو صدمہ پہنچتا ہے اور وہ حویلی میں چل رہی کھدائی کو وہ جیتے جی قبر کی کھدائی کا نام دیتے ہیں۔

اگلے باب میں ایک نئی تبدیلی نظر آتی ہے۔ رحمٰن کی ماں جو کبھی بے پردہ گھر سے باہر نہیں گئیں۔ پہلی بار گھر سے بے پردہ کو تو الی جاتی ہیں۔ یہاں ایک بدلتی ہوئی تہذیب سامنے آتی ہے۔

''یا یہ کہ ایک نئی دنیا، گمشدہ خزانے یا قبر کے راستے ویران ہوتی حویلی سے جنم لے رہی تھی۔ یا یہ ۔۔۔۔۔۔۔ کہ ایک انڈا ٹوٹ گیا تھا۔ ایک نئے پرندے کے ساتھ، یہ دنیا تیزی سے نئی تبدیلیوں کی کہانی لکھنے والی تھی۔''

نئی تبدیلیاں ہو رہی تھیں لوگ حویلیوں سے نکل کر کالونیوں میں رہنے لگے۔ ایک ہی فلور پر چار چار گھر وہ چاندنی رات کا نظارہ دیکھنے سے قاصر تھے۔ ایک نیا کالونی کلچر سامنے آیا۔ لوگ مرغیوں کی طرح دربے جیسے گھروں میں بند ہو گئے۔ اپنے کام سے کام تیز رفتار زندگی نے اپنے پنکھ کھول دئے تھے۔ حویلیاں فروخت ہونا شروع ہوگئی تھیں۔ پہلی حویلی نواب لٹھن کی تھی جو فروخت ہوئی اور محلے میں تذکرہ کا سبب بنی۔ اگر مسلمان کی حویلی یا کوٹھی فروخت ہو رہی ہو تو مسلمان خریدار ہی تلاش کئے جاتے تھے۔ ہندو کی ہے تو ہندو خریدار لیکن ان تبدیلیوں نے مذہب کی دیوار ہٹا دی تھی۔ کسی بھی مذہب کا آدمی خریدار بن سکتا تھا۔

''آزادی کے بعد یہ ایک نئے انقلاب کی تیاری تھی۔
یہ بدلتی ہوئی دو دنیائیں تھیں۔

Scanned with CamScanner

ایک دنیا حویلی کی تھی۔
اور ایک دنیا حویلی کے باہر کی تھی۔
اور مجھے یقین تھا ترقی کے راستے حویلی سے باہر ہو کر جاتے ہیں۔''

نور محمد جو رحمٰن کو بڑا بھائی مان کر ہر کام کے لئے مشورہ لیتا تھا اس کے برعکس رحمٰن نادرہ کی شادی نور محمد سے نہیں ہونے کے راستے تلاش رہا تھا۔ پر اسے ناکامی حاصل ہوتی ہے۔ نادرہ اور نور محمد کی شادی ہو جاتی ہے لیکن رحمٰن کا ذہن اس بات کو قبول نہیں کر پایا۔ نادرہ کی زندگی خوشحال تھی پر بیماری کے سبب موت کے آغوش میں چلی جاتی ہے۔ اپنی بیٹی نگار کو چھوڑ کر جو پیدائش کے بعد سے ہی مسلسل روئے جا رہی تھی۔ نگار اینکزائٹی ڈس آرڈر کا شکار ہو گئی تھی۔ اس طرح کی بیماری کے بچوں کی تعداد کافی بڑھ گئی ہے۔

''یہ رپورٹ دیکھو۔ یہ سینفرانسسکو کی ایک عورت کے بارے
میں ہے۔ پیدائش سے ۶۲ سال کی عمر تک وہ مسلسل روتی رہی
اور ۶۲ سال کی عمر میں اس کی موت ہوئی۔''

آپ سوچ سکتے ہیں ایسی حالت میں اس کا اور اس کے گھر والوں کا زندگی گزارنا کتنا دردناک ہوا ہوگا۔ اس بیماری کا ڈاکٹروں کے پاس کوئی علاج نہیں تھا پر ایک فارمولہ نکالا تھا۔ mercy death کا جو کہ مہذب دنیا کے لوگوں کو منظور نہ تھا۔ نادرہ کی موت کے بعد نور محمد یہی کہتا تھا کہ میں اپنی بیٹی کو مرنے نہیں دوں گا۔ پر اس زندگی کی قیمت اس کو باپ بیٹی کے مقدس رشتے کو کھو کر چکانی پڑتی ہے۔ رحمٰن کو آیا خط اسے ماضی میں ہوئی دردناک داستان کو پھر سے یاد دلاتا ہے۔ جسے وہ کبھی نہیں بھلا سکا۔ پہاڑی علاقے کی خوبصورت وادیاں بھی ان یادوں کو اپنے اندر چھپا نہ سکیں۔

''گلوبل وارمنگ کے خطروں کی دہائیاں دینے والے کیا اس
سچ سے واقف نہیں تھے کہ تہذیبیں گم ہو چکی ہیں۔''

Scanned with CamScanner

ذوقی نے اس ناول میں تہذیبوں کے تصادم کو بہت اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ کردار نگاری کے اعتبار سے ہر کردار اپنے میں ایک معنویت رکھتا ہے۔ پروفیسر نیلے، نظر محمد، نور محمد، نادرہ ایسے ہی کردار ہیں۔

اس ناول میں ذوقی کی شخصیت کا گہرا اثر ہے بلکہ انہوں نے خود اس کہانی کو اپنی کہانی کہا ہے۔ ذوقی نے تقسیم ہند سے لے کر حال تک کی معاشرہ میں ہو رہی تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے۔ تبدیلی سماج کا اصول ہے۔ تبدیلی ایک نئی تہذیب کو جنم دیتی ہے۔ انسان کو ان تبدیلیوں اور تہذیبوں کے مطابق خود کو ڈھالنے میں کچھ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ذوقی زندگی کے حقائق پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اس ناول میں تہذیب، اخلاق اور زندگی کے بارے میں فکر انگیز مسائل اٹھائے گئے ہیں۔ موضوعات کی اہمیت اور معنویت کے باوجود ناول میں تخلیقیت بھی اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ ذوقی کبھی کبھی اپنی تخلیقی پیشکش میں اتنے شدید اور جارح ہو جاتے ہیں کہ جس سے ناول کی تخلیقیت متاثر ہونے لگتی ہے۔ ناول کا فن ایک آئینہ حقیقت تو ہے۔ لیکن ادھر ادھر سے رومانی عکس بھی جھانکتے نظر آنا چاہئے۔ قطع نظر ان باتوں کے ذوقی کا یہ ناول بحر حال ہمیں غور و فکر کرنے کی طرف مائل کرتا ہے۔ اس ناول میں سماج، نفسیات اور اخلاقیات، ماضی اور حال کی داستان سنائی دیتی ہے۔ یہ سارے عناصر ملکر ذوقی کے ناول کو ایک عمدہ ناول بناتے ہیں۔ ناول نگاری کی فنی مہارت تکنیک اور پلاٹ میں واضح ہوتی ہے۔ کہانی کے کھلنے کا انداز قدیم داستان گوئی کے انداز سے مشابہ ہے جس میں قاری یا سامع کی توجہ اور دلچسپی کو مسلسل قصے پر مرکوز رکھنے کے لیے واقعات کو ایک خاص سوچی سمجھی ترکیب سے پیش کیا جاتا ہے تاکہ تجسس آخر دم تک قائم رہے۔

حواشی:

لے سانس بھی آہستہ، مشرف عالم ذوقی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۱۲ء

Scanned with CamScanner

ہندوستان کے مسلم معاشرہ پر تصوف کے اثرات

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جو صدیوں سے اپنی تہذیب وثقافت کا مرکز رہ چکا ہے اور جس کے آثار اس کے ذرہ ذرہ پر ثبت ہیں اور یہاں کے علما اصحاب کمال اور علم دوست سلاطین وامرا کے علمی وتہذیبی کارنامے کسی اسلامی ملک کے کارناموں سے کم نہیں۔ علم وفن کی ہر شاخ خصوصاً دینی علوم میں ہندوستان میں ایسے ایسے علما پیدا ہوئے کہ جن کی علمی عظمت اسلامی اور عرب ملکوں میں بھی مسلم تھی۔ پہلی صدی ہجری میں یہاں اسلام کے حوصلہ مند دستے آنے شروع ہو گئے تھے ۹۳ھ میں محمد بن قاسم نے سندھ میں ملتان تک کے علاقہ کو اپنی شمشیر سے تسخیر کرلیا تھا۔ لیکن حقیقتاً ہندوستان کی فتح کا سہرا سکندرِ اسلام سلطان محمود غزنوی کے سر ہے اور مستحکم ومستقل اسلامی سلطنت کے قیام کی سعادت سلطان شہاب الدین غوری (۶۰۲ھ) کو حاصل ہوئی۔ لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور حکمراں طبقہ کی موجودگی سے اسلام کی ترویج واشاعت اور اسلامی تعلیمات کی ترجمانی کا کام نامکمل تھا اور اس اہم فریضہ کی ادائیگی ہندوستان میں ان ہی برگزیدہ شخصیات کے ذریعہ پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ جنھیں اسلامی متصوفین کے نام سے جانا اور پہنچانا جاتا ہے۔ لہٰذا ہندوستان میں اشاعت اسلام کے لیے صوفیائے کرام کا کردار اثباتی اہمیت کا حامل تسلیم کیا جاتا ہے۔

صوفیائے کرام کی آمد کا سلسلہ اس ملک میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ تصوف کے مشہور اور مرکزی سلسلے اگرچہ ہندوستان کے باہر پیدا ہوئے لیکن ان کو سب سے زیادہ فروغ اور مقبولیت ہندوستان ہی میں حاصل ہوئی، ان سلاسل تصوف میں بعض ایسی ہندوستانی شاخیں پیدا ہوئیں جنھوں نے خود مستقل سلاسل کی اور جداگانہ طریق سلوک اور تربیت کی شکل اختیار کرلی اور ان میں سے بعض ایسے مجتہد اور مجدد صوفیائے کرام پیدا ہوئے جن کی حیثیت ایک مستقل سلسلہ کے بانی اور

ڈاکٹر صدیقہ جابر، گیسٹ فیکلٹی، شعبۂ عربی، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج، الہ آباد

Scanned with CamScanner

امام کی ہے، ہندوستان میں صوفیاے کرام کے تمام سلاسل خوب ہی پھلے پھولے خصوصاً سلسلہ چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ کو جو اہمیت حاصل ہوئی وہ محتاج بیاں نہیں۔ ان حلقوں کے بزرگوں نے اپنے سلاسل کی ترویج میں مادّی ذریعوں سے نہیں بلکہ روحانی وسائل سے کام لیا اور اپنی پوری زندگی کو سلسلہ کی ترویج کے لیے وقف کر دیا ان مشائخ عظام کی پاکیزہ اور صدق وصفا سے بھرپور زندگی نے لوگوں کے دلوں کو موہ لیا۔

اس کے علاوہ ہندوستان میں بعض ایسے طرق سلاسل بھی پھلے پھولے جو خاص ہندوستان ہی کی پیداوار ہیں اور ان کا انتساب ان شخصیتوں کی طرف ہے جو ہندوستان ہی میں پیدا ہوئیں ان کے مشائخ یہیں آسودۂ خاک ہیں مثلاً سلسلہ مداریہ، قلندریہ، شطاریہ اور مجددیہ یہ تمام سلسلہ ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے اور یہیں سے باہر گئے۔

گیارہویں صدی عیسوی سے تقریباً ہندوستان ہی تصوف کا ایک مرکز ومنبع نظر آتا ہے اسی صدی میں امام ربانی شیخ احمد سرہندیؒ اور ان کے صاحبزادے خواجہ معصومؒ سے ایک عالم نے استفادہ کیا اور ان کے خلفا ہندوستان سے باہر افغانستان، ایران وترکستان میں پھیلے ہوئے تھے، اسی طرح تیرہویں صدی کے سلسلۂ مجددیہ کے شیخ حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ کی خانقاہ میں روم، شام، بغداد، مصر چین، حبش، سمرقند اور بخارا تک کے لوگ استفادہ کے لیے آتے تھے اور ان کے خلیفہ خالد رومیؒ کے ذریعہ یہ سلسلہ عراق، شام، کردستان اور ترکی میں پھیل گیا، چودھویں صدی میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی ذات شیخ العرب والعجم کے لقب سے مشہور ہوئی اور ان سے اہل حجاز اور اس میں آنے والے کثیر التعداد حجاج نے فائدہ اٹھایا اور اس طرح پورے عالم اسلام میں ہندوستان ہی کے ذریعہ اصلاحِ باطن کی یہ شمع روشن ہوئی۔[1]

ہندوستان میں چشتی سلسلہ کی ابتدا خواجۂ خواجگان معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے پاک انفاس سے ہوئی جو خواجہ غریب نواز کے نام سے مشہور ہوئے اور اجمیر میں قیام پذیر اور مدفون ہونے کے باعث ان کو خواجہ اجمیری بھی کہا جاتا ہے، خواجہ معین الدین چشتی کا ہندوستان

Scanned with CamScanner

تشریف لانا ایک زبردست روحانی اور سماجی انقلاب کا رونما ہونا تھا، گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی سماجی حالت حد درجہ تباہ تھی اور چھوت چھات کا ماحول پھیلا ہوا تھا انھوں نے اس ماحول میں اسلام کا نظریۂ توحید عملی حیثیت سے پیش کیا اور بتایا کہ یہ صرف ایک تخیلی چیز نہیں ہے بلکہ زندگی کا ایک ایسا اصول ہے جس کو تسلیم کر لینے کے بعد ذات پات کی سب تفریق بے معنی ہو جاتی ہے یہ ایک زبردست دینی اور سماجی انقلاب کا اعلان تھا، ان کے جانشین خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ ہوئے جن کا مزار دہلی میں مہرولی میں موجود ہے، خواجہ قطب الدینؒ کے جانشین ملتان میں خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ ہوئے جس طرح خواجہ معین الدینؒ ہندوستان میں سلسلہ چشتیہ کے مؤسس اور بانی ہیں اسی طرح خواجہ فرید الدینؒ اس کے مجدد اور اس سلسلہ کے آدم ثانی ہیں۔ ان کے خلفا سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین دہلویؒ نے چشتی سلسلہ کی ترویج میں جو کوششیں فرمائیں وہ تاریخ کے صفحات پر سنہرا باب ہیں ان کے خلفیہ حضرت سید محمودؒ نے اس سلسلے کو مزید آگے بڑھایا اور اس کے بعد حضرت سید گیسو دراز بندۂ نوازؒ نے دکن کی سرزمین میں اپنی روحانی عظمتوں کا لوہا منوایا اور ان کے انفاسِ قدسیہ سے چشتی سلسلہ کو دکن میں بڑا فروغ حاصل ہوا اور آج تک اس سلسلہ کی برکات وہاں جاری و ساری ہیں، خواجہ گیسو درازؒ کے زمانہ تک چشتی سلسلہ کے سینکڑوں خلفا اور لاکھوں مریدین کے ہاتھوں اس سلسلے کی متعدد شاخیں ملک کے اندر پھیل چکی تھیں اور مقامی طور پر اپنی جڑیں مضبوط بھی کر چکی تھیں کہ اب کسی مرکزی نظام کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی کہ چشتی سلسلہ کی رہنمائی کی جائے چنانچہ خواجہ گیسو درازؒ کے بعد چشتی سلسلہ کا مرکزی نظام ختم ہو گیا اور اس سلسلہ کی متعدد شاخیں ہندوستان میں پھلی پھولیں اور ملک کے مختلف حصوں میں اس سلسلے کی عظیم صوفی بزرگ شخصیتیں پیدا ہوتی رہیں۔ صاحب سیر الاقطاب کا یہ لکھنا صحیح ہے:

> ''ہندوستان میں ان کے دم قدم کی برکت سے اسلام کی اشاعت ہوئی اور کفر کی ظلمت یہاں سے کافور ہوئی۔'' [۲]

Scanned with CamScanner

دوسری طرف سہروردی سلسلہ نے ملتان کی سرزمین کے ذرّہ ذرّہ کو تقدس بخشا اور شیخ المشائخ قطب زماں امام السالکین حضرت خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی" حضرت شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ کے خلیفہ پاک نفس نے تمام صوبۂ پنجاب کو سہروردی سلسلہ کے شجر معرفت کے سایہ میں روحانی راحت کا سامان فراہم کیا اور اس آفتاب معرفت کی شعاعیں اگرچہ ہند کے مغربی اور شمالی خطے کو تاباں نہیں کر پائیں لیکن بنگال میں لاکھوں تشنگانِ حقیقت کو سیراب کیا اور اسی طرح بزرگانِ نقشبند میں سے ایک بزرگ اور مقدس ہستی نے دلی کو اپنے قدوم پاک سے نوازا اور مغلیہ دور کی گمراہیوں میں چراغ معرفت روشن کیا وہ بزرگ مجدد الف ثانی کے لقب سے دنیائے طریقت وعرفاں میں پہچانے گئے ان کے انفاس قدسیہ نے ایسا اصلاحی کام کیا کہ اکبری دور کی الحاد و بے دینی کی فضا ماند پڑتی چلی گئی اور اس طرح شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی دینی تصانیف اور حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کے انفاسِ قدسیہ کی بدولت شریعت اور طریقت کا ایک نیا دور شروع ہو گیا اس لیے اورنگ زیب کا دور شریعت کی ترویج کا دور کہا جاتا ہے اگرچہ اس عہد میں تصوف پروان نہیں چڑھا لیکن اس دور کے علما و مشائخ جن چراغوں کو روشن کر گئے تھے وہ موعظت اور خداپرستی سے سرشاران کے تصانیف میں موجود تھے اور مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک تمام برصغیر ہندو پاک میں سلاسلِ صوفیہ یعنی چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ خانوادوں کے سجادہ نشین حضرات نے اپنی زبان اور اپنے قلم سے اس اصلاحی کام کو زندہ رکھا۔

اس طرح ہندوستان میں جو کچھ اشاعتِ اسلام کا کام کیا گیا وہ سب انہیں علماء صوفیائے کرام اور مشائخ کی جدوجہد کا نتیجہ ہے جس کا سہرا خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حسنات اور کارناموں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس ملک پر چشتیہ سلسلہ کا حق قدیم ہے۔ اس سلسلے میں مولانا غلام علی آزاد لکھتے ہیں:

لاشک بزرگانِ چشت عنبر سرشت را حقی است قدیم بر ولایت ہند۔

Scanned with CamScanner

ہندوستانی معاشرہ پر تصوف کے مثبت اور منفی اثرات

ہندوستان کی سرزمین جو ہمیشہ سے روحانیت، رواداری اور محبت کا گہوارہ رہی ہے تصوف کے لیے بہت سازگار ثابت ہوئی تصوف جسکی اساسیات عشق الٰہی، انسان دوستی اور خدمتِ خلق جیسی تعلیمات پر مبنی تھی ان کو قبول کرنے کی صلاحیت ہندوستان کی عوام میں فطری طور سے موجود تھی چنانچہ تصوف کا پودا ہندوستانی آب وہوا میں خوب ہی پھلا پھولا اور اس کی متعدد شاخیں پیدا ہوئیں نتیجتاً اس ملک میں جابجا داعیانِ اسلام کے مرکز و خانقاہیں چھوٹے چھوٹے جزیروں کی طرح قائم ہو چکی تھیں جیسے

''بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی''

صوفیاے کرام کے مزارات اور آثار اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ ہندوستان کا کوئی گوشہ تصوف کی تعلیمات اور صوفیا کی برکات سے محروم نہیں رہا ہے۔ لوگوں کو ان بزرگوں اور ان کی خانقاہوں سے والہانہ عقیدت اور قلبی تعلق تھا۔ اور ان کی طرف رجوع کی جو کیفیت تھی اس کا اندازہ ان واقعات سے ہوسکتا ہے:

''مجدد صاحب کے نامور خلیفہ اور صاحبزادے حضرت خواجہ معصومؒ (۱۰۷۹ھ) کے ہاتھ پر نو لاکھ انسانوں نے بیعت و توبہ کی اور سات ہزار آدمی خلافت سے مشرف ہوئے''۔

سرسید احمد خاں ''آثار الصنادید'' میں حضرت شاہ غلام علیؒ کے متعلق لکھتے ہیں:

''حضرت کی خانقاہ میں پانچ سو سے کم فقیر نہیں رہتے تھے اور سب کا روٹی کپڑا آپ کے ذمہ تھا'' [۳]

تیرھویں صدی کے مشہور مصلح اور شیخ طریقت حضرت سید احمد شہیدؒ کی طرف لوگوں کے رجوع اور اہل طلب کے ہجوم کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے اصلاحی دوروں اور سفر حج کے سلسلے میں جن مقامات سے گزرتے تھے لاکھوں کی تعداد میں مسلمان بیعت کرتے تھے۔ یہ تمام صوفیاے کرام لوگوں کے ہاتھ پر بیعت لیتے اور تمام گناہوں سے توبہ کراتے اور خدا اور رسول کی اطاعت کا عہد لیتے تھے اور بے حیائی بدکاری اور ظلم و زیادتی

Scanned with CamScanner

کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کی پامالی سے بچنے کی تلقین کرتے تھے۔ اور اصلاح باطن کی طرف توجہ دلاتے تھے اس کے علاوہ صوفیاے کرام آنے جانے والے تمام لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے تھے اس طرح ان کے اخلاق اور دینی تعلیم و تربیت اور صحبت کا اثر عام زندگی کے ساتھ ساتھ معاشرہ پر ہوتا تھا اور ان بزرگوں کی عبادات اور معاملات کی برکت سے لوگوں میں سچائی و صداقت پیدا ہوتی چلی گئی۔ ہندوستان کا مشہور مؤرخ قاضی ضیاء الدین برنی عہدِ علائی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

''عہد علائی کے آخری چند سالوں میں شراب، معشوق، فسق و فجور، جوا اور فحاشی وغیرہ کا نام اکثر آدمیوں کے زبانوں پر نہیں آنے پایا۔ بڑے بڑے گناہ لوگوں کے نزدیک کفر کے مشابہ معلوم ہونے لگتے تھے۔ مسلمان ایک دوسرے کی شرم سے سود خوری اور ذخیرہ اندوزی کے کھلم کھلا مرتکب نہیں ہو سکتے تھے، بازار والوں کے جھوٹ بولنے، کم تولنے اور آمیزش کرنے کا رواج اٹھ گیا تھا۔''

حضرت سید احمد شہیدؒ کے دینی و اخلاقی اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے مؤرخ لکھتا ہے:

''کلکتہ میں یک لخت شراب بکنی موقوف ہوگئی، دوکانداروں نے جا کر سرکار انگریزی میں اس کا شکوہ کیا کہ ہم لوگ سرکاری محصول بلا عذر ادا کرتے ہیں اور دوکانیں ہماری بند ہیں، جب سے ایک بزرگ اپنے قافلہ کے ساتھ اس شہر میں آئے ہیں، شہر اور دیہات کے تمام مسلمان ان کے مرید ہوئے اور ہر روز ہوتے جاتے ہیں، انھوں نے نشہ آور چیزوں سے توبہ کی ہے، اب کوئی ہماری دوکانوں کی طرف ہو کر بھی نہیں نکلتا ہے۔'' [۴]

لہٰذا ان واقعات کی روشنی میں ہم ان صوفیاے کرام کی اصلاحی کدوکاوش کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آخر کس طرح اس وسیع و عریض ملک کی آبادی کی کثیر تعداد کو بداخلاقیوں اور بداعمالیوں سے مجتنب رکھا یہ صرف ان مشائخ کے اخلاق اور روحانیت کا ہی نتیجہ تھا۔ ورنہ دنیا کی

Scanned with CamScanner

کوئی بھی حکومت یا قانون اتنی بڑی تعداد کو دائمی طور پر اخلاق واصول کا پابند نہیں بنا سکتا ہے اس طرح ہندوستان میں صحت مند اور صاحب ضمیر معاشرہ کی تشکیل میں ان بے لوث مصلحین اور معلمین اخلاق کا نمایاں کردار رہا ہے۔

ان علما و مشائخ کا ایک بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے مطلق العنان سلاطین اور بادشاہ کو حکومت اور معاشرہ کی بدعنوانیوں کے خطرناک نتائج اور تباہی سے آگاہ کیا، ان کی تربیت اور عملی مثالوں نے لوگوں میں ہمت وحوصلہ اور بے خوفی وشجاعت پیدا کی، جس کی مثالوں سے ہندوستان کے اسلامی دور کی پوری تاریخ بھری ہوئی ہے، ان علما و مشائخ اور ان کے خانوادے نے سر سے کفن باندھ کر اور اپنی زندگی سے ہاتھ دھو کر "افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر" (جابر بادشاہ کے مقابلہ میں حق بات کہنا افضل ترین جہاد ہے) پر عمل کیا اس کے علاوہ ان صوفیائے کرام نے سلطنت کے اعلیٰ عہدوں اور دولت مند بادشاہوں کے گراں قدر پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کیا اور زہد واستغناء قناعت وتوکل اور خودداری کی ایسی روایت قائم کی کہ جس نے ہندوستان کے معاشرہ میں کردار کی مضبوطی اور بلند نظری کے اوصاف اور عناصر کو زندہ رکھا۔

غرض یہ کہ ہندوستان کے فقر وتصوف کی تاریخ زہد واستغنا خودشناسی اور ایثار وقربانی کے حیرت انگیز واقعات سے بھری ہوئی ہے اور ان مثالوں سے کسی سلسلۂ طریقت اور کسی خانوادۂ تصوف کی تاریخ خالی نہیں ہے۔

ہندوستان کے صوفیائے کرام نے علم کی اشاعت میں بھی بہت اہم رول ادا کیا وہ ہمیشہ سے ہی علم کے سرپرست اور پشت پناہ رہے اور ان میں اکثر وبیشتر اعلیٰ علمی وادبی ذوق رکھتے تھے اور ان کا روز اوّل سے یہی عقیدہ تھا۔

کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

اسی بنا پر انھوں نے بڑے بڑے عالی استعداد طالب علم کو اس وقت تک اجازت نہیں دی جب تک کہ انھوں نے اپنی علمی تکمیل نہیں کر لی ۵؎ لہٰذا ہندوستان کی تعلیمی تحریک اور علمی سرگرمیاں بھی

Scanned with CamScanner

بالواسطہ اور بلاواسطہ انہیں مشائخ طریقت کی سرپرستی کا نتیجہ ہیں جس کا اندازہ ہم ان مشائخ کی خانقاہوں، مدارس اور درسگاہوں سے لگا سکتے ہیں ان مشائخ کی خانقاہوں کے ذریعہ ہزاروں بندگانِ خدا کی حاجت پوری ہوتی اور بہت سے گھروں میں انہیں کی بدولت چراغ جلتا اور چولہا گرم ہوتا تھا اور بے شمار خدا کے بندے ان کی خانقاہوں میں آ کر پیٹ بھر کھانا کھاتے۔ ان کے یہاں امیر و غریب شہری و دیہاتی کی کوئی تفریق نہیں ہوتی خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا دسترخوان وسعت اور تکلفات کے لیے ضرب المثل تھا اسی طرح شیخ سیف الدین سرہندی کی خانقاہ میں ایک ہزار چار سو آدمی دونوں وقت اپنی فرمائش کے موافق کھانا کھاتے تھے۔ ان صوفیائے کرام کی تعلیم و صحبت سے لوگوں میں بلاتفریق مذہب وملت اور بلاتخصیص رنگ و نسل محبت کرنے اور ان کی خدمت کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ ان مشائخ کا اس ارشاد نبوی پر کامل ایمان اور عمل بھی تھا کہ "الخلق عیال اللہ فأحبھم الی اللہ انفعھم لعیالہ" وہ ساری دنیا کے غم خوار تھے اور بجا طور پر کہہ سکتے تھے کہ ؎

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

مذکورہ بالا واقعات کی روشنی میں ہم اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہندوستان میں تصوف کی ابتداء نیک جذبے کے تحت ہوئی تھی اور اس کی داغ بیل ڈالنے والے صوفیائے کرام نیک اور عبادت گزار بندے تھے اور وہ لوگوں کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی تعلیم دیتے تھے لیکن زمانہ کے مرور و انقلاب کے ساتھ ساتھ اہلِ تصوف اور اس کے متبعین کے طور طریقوں میں انحطاط و زوال رونما ہوا۔ تصوف کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس سلسلہ کا آغاز نیک جذبات کے تحت ہوا تھا۔ اور ماضی میں ہندوستانی معاشرہ کی تشکیل نو میں انقلاب آفریں رول ادا کیا تھا۔ لیکن مرور ایام کے ساتھ آہستہ آہستہ اسی تصوف نے سلوک اور آخر میں رسوم کی شکل اختیار کر لی اور ہندوستان میں جس سلسلہ کی ابتدا ریاضت و مجاہدات اور دعوت و تبلیغ سے ہوئی تھا اس میں ایسی تبدیلی ہوئی کہ آخر میں اس کے نظام کے صرف تین نمایاں عناصر ترکیبی رہ گئے۔

(۱) وحدت الوجود کے عقیدہ میں غلو اس کی اشاعت کا انہماک اور اس کے باریک و دقیق

Scanned with CamScanner

مضامین کا اعلان وتذکرہ۔

(۲) محافل سماع کی کثرت، اور رقص کا زور۔

(۳) اعراس کا اہتمام اور ان کی رونق وگرم بازاری جو شرعی حدود وقیود سے بے نیاز ہے[۶]

لیکن رفتہ رفتہ دنیائے تصوف میں علم کا چراغ بجھ جانے کی وجہ سے تصوف کی دنیا تاریک ہوگئی۔ اس فرقے نے اپنے عقائد میں اس قدر غلو اختیار کیا کہ عیسائیوں کے نظریہ تثلیث کو بھی پیچھے چھوڑ دیا اور دین اسلام کا حلیہ ہی بگاڑ کر رکھ دیا۔ حالانکہ بہت سے صوفیائے کرام نے ان حلقوں سے تعلق رکھنے والوں کی تردید بھی کی ان مشائخ میں ایک نام حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کا ہے انہوں نے بروقت دین کی حفاظت کا کام انجام دیا اور مسلمانوں کو غالی صوفیوں کی بے اعتدالیوں ملحدین کی تحریفات اور باطنیت وزندقہ کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی اور ان مغالطوں کا پردہ چاک کیا اور بداعتقاد صوفیوں جاہل مشائخ اور ان کی دعوت وتبلیغ سے مسلمانوں کو بچانے کے لیے اپنے مکتوبات میں ان سب عقائد وخیالات پر ضرب کاری لگائی جس کے پردہ میں ہندوستان میں الحاد اور زندقہ پھیل رہا تھا۔ اور اسلامی عقائد متزلزل ہو رہے تھے۔[۷]

اسی طرح تصوف کے بعض حلقوں میں ایک مغالطہ یہ بھی پھیلا ہوا تھا کہ شریعت کی پابندی اور پیروی کی ضرورت ایک خاص وقت اور حد تک رہتی ہے اور جب مسالک مقام تحقیق اور مرتبہ یقین پر پہنچ جاتا ہے اور واصل باللہ ہو جاتا ہے تو پھر شریعت کی پابندی اور اس کے فرائض سے آزاد اور مستغنی ہو جاتا ہے اس عقیدہ نے بہت مقبولیت حاصل کر لی تھی اور بے عمل صوفیوں نے اس کے ذریعہ بڑا فتنہ برپا کیا کہ اس کی چپیٹ میں بعض پڑھے لکھے لوگ بھی آ گئے اور وہ اُس عقیدہ کو ثابت کرنے کے لیے قرآن کی اس آیت ''واعبد ربك حتى يأتيك اليقين'' سے استدلال کرنے لگے۔ کہ شریعت کا سلسلہ یقین حاصل ہو جانے کے بعد ساقط ہو جاتا ہے۔

حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے اس گمراہ کن عقیدہ اور مغالطہ کی زبردست تردید کی اور فرمایا کہ ''کسی حال اور کسی وقت میں بھی نہ تکالیف شرعیہ اور فرائض دینیہ ساقط ہوتے ہیں

Scanned with CamScanner

اور نہ کوئی انسان اس سے مستثنیٰ ہے۔ انہوں نے اس عقیدہ کی بھی تردید کی جس کا ماننا تھا کہ ولایت کا مقام نبوت کے مقام سے افضل ہے اور فرمایا ''نبوت کا مقام ولایت سے کہیں اعلیٰ وارفع ہے۔ نبی کے تمام احوال واوقات ولی کے احوال واوقات سے افضل ہیں بلکہ انبیا کی ایک سانس اولیا کی تمام عمر سے افضل ہے'' اور مزید فرمایا کہ ''جو شخص طریقت سے شریعت کا تابع نہیں ہوگا اس کو طریقت سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا'' ۸ انھوں نے اس سلسلہ میں بہت محققانہ اور عارفانہ باتیں لکھی ہیں کیونکہ وہ خود ولایت ومعرفت کے اعلیٰ مراتب پر فائز تھے اور ان کا ہر لفظ تجربہ اور مشاہدہ پر مبنی ہے کہ

قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

یہ تمام علما ومشائخ وصوفی جو اپنے مجاہدات وریاضات کے ذریعہ درجہ کمال پر پہنچے انہوں نے شریعت کی پابندی میں سے ہر پابندی کو ایک راز سمجھا جس سے آخرت کی سعادت مربوط اور وابستہ ہے یہاں تک کہ ان بزرگوں نے دم آخر تک آداب شریعت میں سے ایک ادب بھی ترک نہیں کیا۔

اور حقیقت یہی ہے کہ مجاہدات وریاضات تزکیہ نفس اور قرب الٰہی سے عشق الٰہی اور جذبہ شوق کا جو مرتبہ حاصل ہوتا ہے اس میں ہر رونگٹے سے یہی آواز آتی ہے

ہمارے پاس کیا ہے جو فدا کریں تجھ پر
مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں ۹

مگر افسوس کہ جن مشائخ کی دعوت وتبلیغ انبیاے علیہم السلام کی زندگی کی تصویر اور شریعت کی پابند تھی انقلاب زمانہ سے خود ان کی ذات مطلوب ومقصود اور خود ان کا آستانہ مسجود ومعبود بن گیا۔ اور تصوف اسلام کی ساری تعلیمات سے بہت دور نکل گیا اور اس کے نام پر ہر طرح کی توہم پرستی جاری ہوگئی اور تصوف اصلاح باطن اور تزکیۂ نفس کے بجائے چند رسوم وروایات کا مجموعہ بن گیا۔ یہاں تک کہ حالت یہ ہوگئی کہ غیر مسلم آبادی کے لیے یہ ایک معمہ اور سوال بن کر رہ گیا کہ آخر

Scanned with CamScanner

اسلام اور دوسرے مذاہب میں عملاً فرق کیا ہے؟

چنانچہ قرآن و حدیث کی تعلیمات محدود ہو کر رہ گئیں اور اتباع شریعت جس پر صوفیا و مشائخ نے بہت زور دیا تھا وہ اہل ظاہر کا شعار اور ناشناسوں کی علامت بن کر رہ گیا اور لوگوں نے شریعت اور طریقت کو دو الگ الگ کوچے میں تسلیم کر لیا اور مشائخ متقدمین نے جس طریق کی ممانعت کی تھی وہ موجودہ معاشرہ کے لوگوں کا طریقہ کار بن گئیں اور جس کے منفی اثرات ہندوستانی معاشرے پر نظر آتے ہیں اور درد عشق کی جنس جو طریقہ چشتیہ کا سرمایا تھا اس بازار میں ایسی نایاب ہوئیں کہ بقول ابوالحسن علی ندوی طالب صادق کو حسرت سے یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ ۱۰

''وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دُکان اپنی بڑھا گئے''

حوالہ جات:

۱۔ تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک، ابوالحسن علی الحسنی الندوی، ص ۹۲، ۹۴

۲۔ فوائد الفواد، امیر علا سنجریؒ، ص ۳۰

۳۔ تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک، ابوالحسن علی الحسنی الندوی، ص ۹۵

۴۔ ماخوذ ''بزم صوفیا'' باختصار، ص ۲۰۲۔

۵۔ ملاحظہ ہو واقعہ سراج الدین اودھی ''فوائد الفواد و سیر الأولیاء''۔

۶۔ تاریخ دعوت و عزیمت، ابوالحسن علی الحسنی الندوی، ص ۱۷۳۔

۸۔ www.wikipedia.com

۹۔ تاریخ دعوت و عزیمت، ابوالحسن علی الحسنی الندوی، ص ۳۰۹۔

۱۰۔ سیرت سید احمد شہیدؒ، ابوالحسن علی الحسنی الندوی، ص ۵۴۹۔

۱۱۔ تاریخ دعوت و عزیمت، ابوالحسن علی الحسنی الندوی، ص ۱۷۳۔

Scanned with CamScanner

'تہذیب نسواں' کی خدمات

۱۹ویں صدی کے اوائل میں اردو کا کوئی اخبار یا رسالہ نہیں تھا جو حقوقِ نسواں کی بات کرتا۔ ۱۸۷۵ء میں 'اصلاحِ نسواں' کے نام سے اردو کا پہلا ناول پٹنہ سے رشید النساء بیگم نے شائع کیا تھا۔ لیکن وہ محدود طبقے کو ہی متاثر کر سکا۔ لاہور سے تعلق رکھنے والے شمس العلماء سید ممتاز علی ۱۸۳۵ء۔ ۱۸۶۰ء [1] کا خیال اس طرف گیا۔ انھوں نے اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ مغربی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ اُن کے تعلقات لکھنؤ کے کرامت حسین اور علی گڑھ کے شیخ عبداللہ سے تھے۔ یہ سب حضرات تعلیم نسواں کے حامی تھے۔ سید ممتاز علی نے جب دیکھا کہ برطانوی نظامِ حکومت میں حقوقِ نسواں کو لے کر اسلامی شریعت پر تنقید کی جا رہی ہے تب انھوں نے قرآن و حدیث کو بنیاد بنا کر عوام کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے سمجھایا کہ برطانوی حکومت عورتوں کی آزادی یا معاشرے میں اُن کے مقام کو لے کر جو باتیں بنا رہی ہے، ہماری اسلامی شریعت میں خواتین کو معاشرے میں اس سے زیادہ تحفظ اور اونچا مقام حاصل ہے اور مرد و زن دونوں کی تعلیم کو فرض قرار دیا گیا ہے۔ خواتین کو لے کر مردوں کی بے اعتباری اور لاپرواہی کی وجہ سے عورتیں اپنے حقوق سے نابلد ہیں۔ اسی لئے خاندانی نظام درہم برہم ہو رہے ہیں اور خواتین معاشرے سے کٹ کر رہ گئی ہیں۔ ممتاز علی پردے کے مخالف نہیں تھے بلکہ وہ خواتین کو اُن کے جائز حقوق دلوا کر معاشرے میں اونچا مقام دلوانا چاہتے تھے۔ [2]

اس سلسلے میں ممتاز علی علی گڑھ کے قائدین سے بھی وقتاً فوقتاً جا کر ملا کرتے تھے۔ وہ سرسید احمد خاں سے اہم امور پر مشورے بھی لیا کرتے تھے، لیکن اختلافی نظریات کی بنا پر وہ ہمیشہ اُن کے مشوروں پر عمل نہیں کیا کرتے تھے۔ جب بھی وہ سرسید سے حقوقِ نسواں کے موضوع پر گفتگو کرتے سرسید حد درجہ ناراض ہو جاتے۔ ایک مرتبہ سرسید نے حقوق نسواں پر اُن کی تحریر کو پڑھ کر اسے ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا مگر انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور بعد میں اُسی تحریر کو اٹھا کر

ڈاکٹر نزہت فاطمہ، گیسٹ فیکلٹی، شعبۂ قرون وسطیٰ تاریخ، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج، الہ آباد

Scanned with CamScanner

''حقوقِ نسواں'' کے نام سے اپنی کتاب چھپوائی تھی۔ [۳] ایک اور موقع پر ممتاز علی نے سرسید کو خط لکھا کہ وہ مسلم خواتین کے لئے ایک اخبار یا رسالہ نکالنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مجوزہ رسالے کے ممکن ناموں کی ایک فہرست بھی بھیجی اور اس بارے میں اُن کی ترجیح مانگی، حالانکہ ممتاز علی نے رسالے جاری کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں اُن کی رائے نہیں مانگی تھی مگر سرسید نے پھر اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے اُنھیں خبردار کیا کہ اگر ممتاز علی خواتین کے واسطے ایک اشاعت کا آغاز کرنا چاہتے ہیں تو انھیں عوام کی ناپسندیدگی ہی حاصل ہوگی اور آخر میں وہ ناکام ہو جائیں گے۔ لیکن دوسری جانب سرسید نے یہ بھی مشورہ دیا کہ اگر وہ اپنی اس حماقت پر قائم رہنا چاہتے ہیں تو انھیں اپنے (سرسید کے) رسالے 'تہذیب الاخلاق' کے براہ راست جواب میں اس رسالے کا نام 'تہذیب نسواں' رکھنا چاہئے۔ آخرکار سرسید کے اِن الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے ممتاز علی کے منتخب منشا کی چاہے تعریف نہ کی ہو مگر اُن کی ہمت و جرأت کی داد ضرور دی۔ سرسید کے جواب ملنے کے چند ہفتے بعد ہی ممتاز علی کو سرسید کی وفات کی خبر پہنچی۔ اس طرح انھوں نے تین ہفتوں بعد 'تہذیب نسواں' شائع کرنا شروع کر دیا۔ [۴]

۱۸۹۸ء میں 'رفاہِ عام' پریس، لاہور سے شائع ہونے والا ہفتہ وار اخبار (رسالہ) 'تہذیب نسواں' خواتین کا پہلا اردو اخبار تھا جس کی مدیرہ ممتاز علی کی اہلیہ محمدی بیگم تھیں جنھوں نے گھر میں رہ کر تعلیم حاصل کی تھی اور متوسط طبقے کی ایک پردہ نشین خاتون تھیں۔ اُس وقت متوسط گھرانوں کی مسلم خواتین جو گھروں میں رہتی تھیں اُن تک اس اخبار کی رسائی تھی اور بہت جلد 'تہذیب نسواں' مسلم خواتین کا ہر دلعزیز اخبار بن گیا جیسا کہ قرۃ العین حیدر اپنی خودنوشت 'کارِ جہاں دراز' میں رقمطراز ہیں :

> ''یکم جولائی ۱۸۹۸ء ایک اہم تاریخ ہے۔ اس روز لاہور سے شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی نے زنانہ ہفتہ وار اخبار ''تہذیب نسواں'' جاری کیا۔ ان کی بی بی محمدی بیگم (والدہ سید امتیاز

Scanned with CamScanner

علی تاج) نے اخبار کی ادارت سنبھالی۔ بہت جلد 'تہذیب' سارے ہندوستان کے متوسط طبقے کے اردوداں مسلم گھرانوں میں پہنچنے لگا۔ اس کی وجہ سے معمولی تعلیم یافتہ پردہ نشیں خواتین میں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہوا اور دیکھتے دیکھتے انہوں نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ ناول لکھنا شروع کر دیئے جو تکنیک اور موضوع کے لحاظ سے آج ستر برس بعد لکھے جانے والے بیشتر عام ناولوں سے کسی طرح کم نہیں۔'' ۵

۱۹ویں صدی میں کسی مسلم گھرانے کی خاتون کا زنانہ اخبار کی ادارت کا کام سنبھالنا بہت بڑی بات تھی۔ ہمارا تنگ نظر معاشرہ اسے قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس لئے ابتداء میں محمدی بیگم کو اس سلسلے میں بہت سی مخالفتیں برداشت کرنی پڑیں۔ مردوں کی بڑی تعداد ان کے خلاف تھی اور اس اخبار کو بند کروانے کے درپے تھی۔ کئی مقامات پر اخبار کو پہنچنے نہیں دیا گیا۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ اس کی کاپیوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ اس وقت محمدی بیگم کو جس درد و کرب سے گزرنا پڑا اُس کا اظہار انھوں نے اپنی ایک نظم میں اس طرح کیا ہے۔

فرقۂ اخبار جو ہے مدعی ورد قوم
ورد جس کا رات دن ہے ہائے قوم اور وائے قوم
جو کہ ورد قوم میں ہیں رات دن زاری کناں
حب وطنی سے بنے جاتے ہیں محبوب جہاں
حامیِ تعلیم نسواں اور جہاں بھر کے لئیق
قوم غم سے اشک جاری اور خلقت پر شفیق
کیا انھوں نے واسطے تہذیب نسواں کے کیا
ان کا دل تہذیب کے حق میں تو پتھر ہو گیا
یہ صلے اہل وطن سے ہیں ملے بہنوں ہمیں ۶

Scanned with CamScanner

لیکن ان دشواریوں کے باوجود محمدی بیگم کے پائے استقامت میں ذرا بھی لغزش نہیں آئی۔ وہ پہلے سے زیادہ عزم واستقلال سے اپنا کام سرانجام دیتی رہیں۔ بقول قرۃ العین حیدر:

"مخالفین کے اعتراضات کی وجہ سے نام کا پردہ ضرور تھا۔ چنانچہ 'تہذیب' کے سرورق پر چھپتا تھا۔ "والدہ افضل علی" اور نذر زہرا نے "بنت نذر الباقر" یا "مس نذر الباقر" کے نام سے لکھا۔ مردانہ اخباروں میں یہ بحث بھی چھڑی کہ کیا شریف مسلمان لڑکیوں کا خود کو انگریزی لقب "مس" سے یاد کرنا مناسب ہے یا سخت بے ہودہ بات ہے۔" ۷

محمدی بیگم نے غذائیات، صفائی و وضع داری اور ذاتی تعلقات جیسے موضوع پر کئی مضامین لکھے۔ زیادہ تر مضامین رسم و رواج کو سادہ، آسان اور سہل بنانے، اصلاح لباس، مذہبی دستور العمل، جہیز کی رسم اور زیورات پر ہونے والے فضول خرچی کو ختم کرنے کے بارے میں ہوتے تھے۔ قرۃ العین حیدر بیان کرتی ہیں:

"اصلاح لباس کی تحریک شروع ہوئی ۱۹۰۵ء میں تہذیب" میں یہ سوال اٹھایا گیا کہ ہم کیا پہنیں؟ "کھنچواں پاجامہ جس کی رسم اٹھتی جا رہی ہے یا شلوار۔ سب بہنیں اپنے اپنے لباس سے آگاہ کریں۔" ۸

آبرو بیگم ہمشیرہ ابوالکلام آزاد بمبئی سے لکھتی ہیں:

"میرے والد چالیس سال مکے میں رہے۔ سولہ سال قبل کلکتہ آئے۔ کلکتہ کی معزز خاتونوں کا لباس ساری اور شلوکہ ہے۔ میں دہلوی لباس کے مقابلے میں عربی لباس کی سفارش کرتی ہوں۔" ۹

راحت خاتون بیگم بدرالدین طیب جی بحث میں حصہ لیتی ہیں اور زہرا فیضی کی والدہ امیر النساء رقمطراز ہیں:

"میں آپ کو اپنی چھوٹی لڑکی عطیہ خانم کے لباس

کی تصویر بھیجوں گی۔ زبیدہ خانم لندن گئی تھیں
وہاں ان کے لباس کی بہت تعریف ہوئی۔'' ۱۰

اکبری بیگم اور نذر زہرا بیگم نے گھر سواں بھاری پائجامے اور بھاری زیورات ترک کیے۔ ہلکے پھلکے غرارے اور گاؤن مع دوپٹے کے خود ڈیزائن کر کے پہننے شروع کئے جو فیشن ایبل طبقے میں رائج ہوئے، نذر زہرا بیگم نے جدید طرز کا برقعہ ایجاد کیا۔

۱۹۰۵ء سجاد حیدر یلدرم کی پھوپھی زاد بہنیں خان بہادر صغیر حسین کی لڑکیاں حمیدہ بیگم، وحیدہ بیگم چھوٹے چھوٹے مضامین 'تہذیب نسواں' میں لکھتی ہیں۔ یلدرم کی چچازاد بہن نثار فاطمہ بنت بہادر ڈاکٹر کرار حیدر 'نصیحت' مضمون میں فرماتی ہیں ؎

شکر اللہ کا کہ ہم علم سے ہیں بہرہ مند　　اس سے بڑھ کر نہیں دولت مری پیاری بہنو
اچھا کرتی ہو منگاتی ہو جو 'تہذیب' اخبار　　اس سے بڑھتی ہے لیاقت مری پیاری بہنو

ن۔ف۔ نہٹور ضلع بجنور

پلول سے ایک بی بی نے لکھا:

''تہذیب' سے ہمیں بہت فائدے ہو رہے ہیں۔ پیشتر دنیا کے حالات
کی خبریں نہیں تھیں اب سب خبریں معلوم ہو رہی ہیں۔۔۔۔'' ۱۱

'تہذیب نسواں' میں مستقل طور سے نکلنے والے مضامین میں خواتین کے شرعی حقوق اور تعلیم نسواں کی ضرورت کے بارے میں ممتاز علی کے مباحث ہوا کرتے تھے۔ اخبار کے ہفتہ وار ہونے کی وجہ سے اخبار کے قاریوں کے درمیان آپس میں رابطہ پیدا کرنا ممکن ہوتا تھا۔ دوسری مد میں عورتوں کے اجلاس کی اطلاعات کے خلاصے اور اسکولوں کے لئے رقم جمع کرنے کی گزارش پر مشتمل مضامین ہوتے تھے۔ قرۃ العین حیدر تحریر کرتی ہیں:

''بنت نذر الباقر اور چند خواتین نے زنانہ کانفرس قائم کرنے کی
تحریک شروع کی۔ ایک بی بی معترض ہوتی ہیں، ''کوئی شخص سیڑھیاں

Scanned with CamScanner

ملے کئے بغیر ایک کے نہیں چڑھ سکتا۔ ہم عورتیں پہلے ڈولی میں بیٹھتی ہیں، پھر گاڑی میں، پھر ریل میں، ہماری تعلیم ابھی ابتدائی حالت میں ہے۔ ہم ابھی اپنے آپ کو پڑھے لکھوں میں نہیں گن سکتے۔ ہماری چند بہنوں نے زنانہ کانفرنس کے لئے مردانہ رسالوں میں مضمون لکھنے شروع کر دیے ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ ہم پہلے زنانہ انجمنیں ہر شہر میں بنائیں۔" [۱۲]

فاطمہ بیگم ہمشیرۂ آبرو بیگم اطلاع دیتی ہیں:

"آبرو بیگم کی شادی ہونے والی ہے اور انہوں نے اشارۃً مجھے سخت تاکید کر دی ہے کہ رسوم پر روپیہ برباد کرنے کے بجائے تعلیم نسواں پر خرچ کیا جائے۔" [۱۳]

'تہذیب' کی طرز تحریر گفتگو کے انداز میں ہوتی تھی اور الفاظ کے ذخائر صاف اور سادہ ہوتے تھے۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے 'تہذیب نسواں' کے عنوانات کی تعداد اور الفاظ کے ذخائر کی وسعت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اب خواتین تعلیم کے زیور سے آراستہ ہونے لگیں اور گھر کے باہر کے تمام اسباب میں اُن کی شمولیت کا ظہور ہونے لگا۔ اس اخبار کے ذریعے ہزاروں پردہ نشین خواتین کو اپنے گھر کی چہار دیواریوں کی قید سے آگے نظر ڈالنے کے لئے ایک کھڑکی مہیا ہو گئی جس سے وہ باہر کی دنیا سے روشناس ہونے لگیں۔ اس اخبار کا مقبول ترین حصہ 'محفلِ تہذیب' تھا جس میں مدیرہ کو لکھے خطوط اور اس کے جوابات ہوتے تھے، لیکن بہت سے خطوط قاریوں کی طرف سے قاریوں کو مخاطب کر کے لکھے جاتے تھے جن میں تہذیبی بہنیں ایک دوسرے سے تعلیمی باتیں، باغبانی کے طریقے اور امور خانہ داری کے انتظامات کے بارے میں پوچھا کرتی تھیں۔ اس طرح تہذیبی بہنوں کا جال بن گیا تھا۔" [۱۴]

دوسری جانب محمدی بیگم کو اس زمانے کی معزز خواتین قلم کاروں کی معاونت حاصل

Scanned with CamScanner

تھی، جن میں بمبئی کی زہرا فیضی اور اُن کی بہن عطیہ فیضی، سیالکوٹ کی نذر الباقر، کلکتہ کی خجستہ اختر بانو سہروردی اور بیگم بھوپال وغیرہ شامل تھیں۔ عطیہ فیضی اپنے یورپ کے سفر کی روداد بھیجتی تھیں جو ہفتہ وار چھپتی تھیں۔ نذر الباقر مختصر کہانیاں اور مضامین لکھتی تھیں اور ساتھ ہی لڑکیوں کی درس گاہیں قائم کرنے کے لئے رقم جمع کرنے کی درخواست کرتی تھیں۔ ۱۵

بدقسمتی سے ۱۹۰۸ء میں محمدی بیگم کا انتقال ہوگیا۔ ان کی وفات کے بعد بھی 'تہذیب نسواں' جاری رہا جو ان کے کارناموں کی حصولیابی کے لئے بہت بڑی خراجِ عقیدت تھی۔ محمدی بیگم کے بعد ممتاز علی کی دختر واحدہ اس کی مدیرہ بنیں اور ۱۹۱۳ء تک رہیں۔ پھر ان کی بہو آصف جہاں نے اس کی ادارت کا کام سنبھالا بعد میں ان کے بیٹے سید امتیاز علی تاج اور ان کی اہلیہ حجاب اسماعیل نے اس خاندانی مہم کو جاری رکھا۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی تک ممتاز علی و محمدی بیگم کے ورثاء کے زیرِ ہدایت یہ اخبار جو رسالے کی شکل اختیار کر گیا تھا نکلتا رہا۔ ۱۶

'تہذیب نسواں' کی بعد کی جلدیں خواتین کے بڑھتے ہوئے معیار ان کے گھروں سے باہر کی کارگزاریوں اور کئی طرح کی مشغولیت پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اس کی طرز تحریر اب بھی صاف وشستہ تھی مگر الفاظ کے ذخائر بڑھنے سے تھوڑی پیچیدہ ضرور ہوگئی تھی۔ اب اجلاس کی خبروں کی تعداد بڑھ گئی۔ خواتین کی تنظیموں میں خواتین کی تقریروں کی روداد اس میں چھپنے لگیں۔ صوبائی شہروں میں خواتین کے گروہ اپنی شہری بہنوں کی تقلید کرتے ہوئے لڑکیوں کو مدرسوں کے قیام کے لئے رقوم جمع کرنے کی درخواست کرنے لگیں۔ اب تہذیب میں خواتین کے لئے انگریزی تعلیم کی ضرورت پر بحث والے مضامین لکھے جانے لگے۔ 'تہذیب نسواں' میں ان خواتین کے نام بھی چھپتے تھے جو بیچلر، ماسٹر اور میڈیکل کی ڈگریاں حاصل کرتی تھیں، اس میں ان کو مبارکباد دی جاتی تھی تاکہ دیگر خواتین ان سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب لیں۔ ۱۷

'تہذیب نسواں' کے ذریعہ سب سے اہم اور خاص کام یہ ہوا کہ خواتین کو ملک کی سیاست میں حصہ لینے کا سنہرا موقعہ ہاتھ آ گیا۔ اس رسالے میں رواں سیاسی منظر، پہلی جنگِ عظیم

Scanned with CamScanner

کے حالات، تحریک عدم تعاون، تحریک سودیشی، چرخہ و کھادی کا اشتہار اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی قائم کرنے کے بارے میں مسلمانوں اور حکومت کے بیچ اختلافات وغیرہ پر مضامین نکلنے شروع ہو گئے۔ اس کے ذریعے خواتین نے سیاسی ضرورتوں، تحریکِ خلافت اور ترکی کی امداد کے لئے رقوم جمع کرنا شروع کر دیا۔ اب تہذیبی بہنوں نے ہندوستان میں سیر بینی کے حالات، یورپ، روم، پیرس اور لندن بلا حجاب کے اور حج کے سفر کے بارے میں لکھنا شروع کیا۔ اس طرح ادبی تنقید منظرِ عام پر آئی۔ پردے پر اعتراضات، کثیر الازواجی اور یک طرفہ طلاق کے بارے میں نوجوان خواتین معاونین نے حصہ لیا۔ اس طرح 'تہذیب نسواں' کے ذریعے مسلم خواتین ہندوستانی معاشرے میں اپنی حیثیت منوانے کے لئے سیاسی طور پر بیدار ہو گئیں۔ وہ اپنے گھروں کی چہار دیواریوں سے باہر نکل آئیں اور مردوں کے شانہ بشانہ تحریکِ آزادی میں حصہ لیا۔ ۱۸

حیدر آباد کی ایک گمنام خاتون نے پہلی بار خواتین کے مفاد پر ایک مضمون لکھ کر اس رسالے میں چھپوایا۔ ۱۹

انھوں نے لکھا کہ مسلم خواتین اس بربادی اور پستی کی وجہ پر نگاہ ڈالیں تو سارے مسلم معاشرے کا پست ہونا ہی اصل وجہ تھی۔ ۲۰ اس خاتون قلم کار نے مَردوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا، تب مسلم خواتین کو اپنی بھلائی کے لئے خود پر بھروسا کرنا پڑا۔ انھوں نے یہ بھی تحریر کیا۔۔ ''خدا اُسی کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔'' ۲۱

اُن کا منصوبہ دو تین دنوں کے لئے مناسب جگہوں پر تعلیم یافتہ مسلم خواتین کا ایک جلسہ منعقد کرنے کا تھا، جس میں خواتین کے مسائل پر سوچا جا سکے۔ ۲۲

اس طرح مسلم خواتین انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں شامل ہونے لگیں۔ ۱۹۱۸ء میں کانگریس کے دہلی کے اجلاس کی نمائندگی گیتی آرا بیگم نے کی۔ انھوں نے 'تہذیب نسواں' میں اپنا مضمون لکھ کر مسلم خواتین کو سیاسی طور پر بیدار کیا اور یہ تحریر کیا کہ۔۔ پنڈال سماج کے مختلف حصّوں میں منقسم کیا گیا تھا، اس میں تین حصّے خواتین کے لئے مختص

Scanned with CamScanner

تھے جبکہ ایک حصہ پردہ نشین خواتین کے لئے تھا۔ اجلاس میں کل ۸۰۰ خواتین تھیں جن میں صرف ۵ ہی مسلم خواتین تھیں۔ دوسرے بیان میں لکھتی ہیں ۔۔۔ لاتعداد ہاتھوں سے تحریر کردہ پرچے پنڈال میں مختلف مقامات پر چسپاں کئے گئے تھے جن میں تحریر تھا ۔۔۔ 'ہندوستان ہندوستانیوں کے لئے، خدا آزادی کا بول بالا رکھے۔' ۲۳

جب غیر ملکی کپڑوں کو ترک کرنے کی بات آئی تو عوام نے یہ معاملہ اٹھایا کہ سبھی غیر ملکی سامانوں کا استعمال بند کیا جائے، تب ممتاز علی نے تہذیب میں لکھا کہ سودیشی تحریک سارے ملک کے لئے فائدہ مند ہے، انھوں نے برطانوی سامانوں کے لئے 'حرام' لفظ کا استعمال کیا اور یہ زور دیا کہ سبھی غیر ملکی کپڑوں کو اپنے جسم سے اتار کر جلا دینا چاہئیے۔ ۲۴

اِسی ضمن میں متعدد خواتین کے مضامین 'تہذیب نسواں' میں شائع ہوئے۔ ۱۴ر جنوری ۱۹۲۲ء 'تحریک سودیشی' عنوان سے امتہ الحبیب خانم نے اپنی تحریر میں اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مسلم خواتین بہت کم تعداد میں سیاسی طور پر فعال ہیں اس لئے اگر تعلیم یافتہ خواتین تحریکِ آزادی میں حصہ لیں گی تو وہ اُسے پورے ہندوستان میں پھیلا دیں گی۔ اپنی معلومات کی بنا پر انھوں نے مسلم خواتین کو چرخہ چلانے کی ترغیب دیتے ہوئے لکھا کہ ۔۔۔ کلکتہ کے ایک کارخانے میں ایسے چرخے بن رہے ہیں جن سے دن بھر میں ایک مَن (۴۰ سیر) سوت کاتے جاتے ہیں۔ خواتین کو چاہیے کہ اس طرح کے چرخے کو حاصل کریں جس سے ملک کو دوہرا فائدہ ہوگا۔ ایک جانب تو کلکتہ کی فیکٹری کو فائدہ ہوگا دوسری جانب غیر ملکی کپڑوں کے بجائے مسلم خواتین خود ساختہ کپڑوں کو استعمال میں لا رہی ہوں گی۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ بھوپال، احمد آباد، شاہجہاں پور اور بنارس میں ہماری بہنیں ایسے کپڑے ڈیزائن کرتی ہیں جو کم قیمت کا ہے اور عمدہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی مشورہ دیا کہ خواتین مراد آباد کے چمچے اور گوالیار کے چینی کے برتن اور کپڑے خریدیں۔ ۲۵

انھوں نے تہذیبی بہنوں کو بتایا کہ میں خود چرخہ چلاتی ہوں اور اپنی بہن سے بھی چرخہ چلواتی ہوں۔ ایک برس سے اُن کے گھر میں کوئی غیر ملکی کپڑا نہیں آیا یہاں تک کہ عید کے موقع پر

Scanned with CamScanner

بھی گھر کے ہر فرد کے لئے کھادی کا کپڑا بنوایا گیا۔ انھوں نے اپنے ہاتھوں سے چرخہ چلا کر سب سے پہلے اپنے لئے ایک جامے نماز بنائی ہے۔ ان کا کہنا تھا اپنے ملک میں بنے کپڑے زیب تن کرنے سے ہندوستان کو برطانوی جوے سے آزادی حاصل ہوگی اور ملک بھی خوشحال ہوگا۔ اس لئے ہر مسلم خاتون کو تحریکِ سودیشی میں حصّہ لینا چاہیے۔ ۲۶

نذر باقر نے ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۱ء کو تحریک ترک موالات اور تحریک سودیشی کی حمایت میں ایک مضمون لکھا جس میں مسلم خواتین کو وہ پیغام دیتے ہوئے تحریر کرتی ہیں:

'میں تم سے مال نہیں مانگتی ہوں لیکن۔۔۔ غیر ملکی کپڑوں کو ترک کردو،
صرف اپنے ملک کے کپڑے پہنو۔۔۔ وہ وقت آرہا ہے جب ہم
بغیر کھادی پہنے باہر نکلنے میں شرم محسوس کریں گے۔'' ۲۷

۱۳ر فروری ۱۹۳۷ء کے شمارے میں تحریر کرتی ہیں:

''اُن کا (خواتین کا) اپاہج پن مردوں کے لئے ایک مسئلہ بن گیا ہے۔'' ۲۸

انھوں نے ۱۹۳۰ء میں 'جانباز' عنوان سے ایک ناول لکھا جو جنگِ آزادی کے پس منظر میں تھا جس میں ۱۹۰۸ء سے آگے کی قیمتی سماجی تاریخ ملتی ہے جو ۱۹۴۲ء سے لے کر اُن کی زندگی کے آخری سالوں تک 'تہذیب نسواں' میں شائع ہوتا رہا۔ ۲۹

۲۱ر جنوری ۱۹۲۲ء کے شمارے میں بیگم اے۔ کے 'تحریک سودیشی' کے عنوان سے لکھتی ہیں کہ سودیشی تحریک کی کامیابی کا انحصار خواتین کی بیداری پر ہے چونکہ اس وقت زیادہ تر مرد سلاخوں کے پیچھے ہیں اس لئے مسلم خواتین کو تحریکِ آزادی میں حصّہ لینا چاہئے ورنہ اس ملک کی تصویر خراب ہوگی۔ انھوں نے اپنی مثال بھی دی کہ میں نے اور میرے خاندان کے ہر فرد نے غیر ملکی ملبوسات کو پوری طرح ترک کردیا ہے۔ ۳۰

۴ر نومبر ۱۹۳۹ء کے شمارے میں محترمہ سیدہ اشرف صاحبہ 'مسلم خواتین اور سیاسیات' عنوان سے رقمطراز ہیں:

Scanned with CamScanner

''سیاسیات خواتین کے لئے ایک نیا علم ہے۔ بالخصوص مسلمان ہندوستانی خواتین اس جدید علم سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ بمشکل ایک فی صد بہنیں اس سے پوری طرح واقف نظر آئیں گی۔ دراصل ہم میں سیاسی، سماجی اور اصلاحی کاموں میں حصہ لینے، اپنے حقوق کو سمجھنے اور ان کی حفاظت کرنے اور اپنی کھوئی ہوئی آزادی حاصل کرنے کی بھی صلاحیت نہیں رہی۔ جو تیرہ سو سال پیشتر اسلام نے ہمیں عطا کی تھی۔۔۔۔لیکن افسوس ہے کہ عام مسلم خواتین اب تک یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ سیاسیات کیا شے ہے؟ میدانِ سیاست میں وہ دیگر قوموں کی خواتین سے بہت پیچھے ہیں۔ جن قوموں کے مرد وزن مساویانہ طور پر اصلاح ملّت کے کاموں میں حصہ لے رہے ہیں۔ اُن کی معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی حالت بھی سنور چکی ہے۔ لیکن نہ ہم خاطر خواہ طور پر تعلیم ہی سے بہرہ اندوز ہو رہے ہیں۔ نہ صنعت وحرفت اور ترویج فنون ہی کا خیال ہے۔ ترقی کے میدان میں دوسری قوموں کی خواتین ہم سے منزلوں آگے نکل چکی ہیں۔ اب بھی وقت ہے کہ ہم بیدار ہوں اور اپنے اندر ملکی وسیاسی معاملات کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کریں۔ ورنہ عجب نہیں کہ ہماری یہ غفلت خود ہماری تباہی کا باعث ہونے کے علاوہ قومی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ کیونکہ عورت ہی مرد کو سیاست، معاشرت اور تمدّن کا پہلا سبق پڑھاتی ہے۔۔۔۔'' ۳۱

آصف جہاں بلگرامی نے ۴/اپریل ۱۹۴۴ء کے شمارے میں 'تحریک سودیشی' پر ایک مفصل مضمون لکھا جس میں انھوں نے جرمنی کی مثال پیش کر کے سمجھایا کہ دوسری جنگِ عظیم کے

Scanned with CamScanner

درمیان جب جرمنی میں چائے کی پتی کی بہت قلت تھی تب ہٹلر نے غیر ملکوں پر انحصار نہیں کیا بلکہ جرمنی کے عوام سے استدعا کی کہ وہ چائے کی جگہ پر شہتول کی پتیوں کا استعمال کریں۔ ۳۲ اسی طرح ہم لوگوں کو بھی غیر ملکی اشیاء پر منحصر نہیں رہنا چاہئے۔ آصف جہاں نے تہذیبی بہنوں کی توجہ ہندوستانی صنعت (ملبوسات) کی گرتی ہوئی حالت اور بے روزگاری کی طرف دلائی اور خواتین کو بیدار کرنے کے لئے یہ بھی تحریر کیا کہ پہلے ہندوستان کے ملبوسات تمام دنیا میں مشہور تھے، مگر انگریزوں نے چالاکی سے ہندوستانی بازاروں کو اپنی گرفت میں لے لیا جس سے کاریگر مزدور بے روزگار ہو گئے۔ اس لئے ملک سے بے روزگاری ختم کرنے کے لئے اپنے ملک کی تیار شدہ اشیا کا استعمال کیا جائے اور یہ بھی پیغام دیا کہ احمد آباد، لدھیانہ، شولاپور، مدراس، میسور اور اورنگ آباد کی خوبصورت ساڑیوں کا استعمال کریں اور انگریزی شیمپو اور تیل کے بجائے شکا کائی، آنولہ اور ٹاٹا کا ناریل تیل استعمال کریں، کیونکہ یہ چیزیں غیر ملکی اشیا سے زیادہ خالص اور عمدہ ہوتی ہیں۔ جبکہ برطانوی سامانوں سے بال سفید ہو جاتے ہیں اور وہ نقصان دہ بھی ہیں۔ ۳۳

'تہذیب نسواں' رسالہ خاتون کے ذریعے، خاتون کا اور خاتون کے لئے تھا۔ اس کے ذریعے مسلم خواتین نہ صرف زیورِ تعلیم سے آراستہ ہوئیں بلکہ ان کا تعلیمی معیار بہتر ہوا۔ اپنے حقوق کے حصول کے لئے وہ بیدار ہوئیں اور اتنا ہی نہیں ملک کی سیاست میں حصہ دار 'تہذیب نسواں' کے ذریعہ خواتین کے مسائل پر بحث و مباحثہ کے لئے ایک پلیٹ فارم مہیا ہو گیا اور یہ اوروں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوا۔ ۲۰ ویں صدی میں اسی سے متاثر ہو کر خواتین کے لئے بہت سے رسالے منظر عام پر آئے، مثلاً خواجہ حسن نظامی اور شریف احمد کی ادارت میں ہفتہ وار 'خواتین کا اخبار'، امتہ الزہرہ کی ادارت میں دہلی سے نکلنے والا ماہنامہ 'عفت'، خورشید اقبال بیگم کی ادارت میں ماہنامہ 'خاتون مشرق'، شوکت علی کا دہلی سے نکلنے والا رسالہ 'نسوانی دنیا'، گوالیار سے نکلنے والا 'خاتون' جس کے مدیر اعلیٰ مرزا مظفر حسین اور مدیر معاون نور جہاں بیگم اور خواجہ حسن نظامی کی ادارت میں 'تبلیغ نسواں' وغیرہ وغیرہ۔

Scanned with CamScanner

حواشی:

۱۔ Tharu Susie and K. Lalita 1991, 'Women Writing in India' 600 B.C. to the present Vol.1;600 B.C. To the early 20th Century , Feminist Press, New York. PXX

۲۔ Minault Gail, ' Women's Rights in Islam', p_ 182

۳۔ ایضاً

۴۔ Minault Gail, 'A Women of Substance, PXX

۵۔ قرۃ العین حیدر، 'کار جہاں دراز'، ص۔۱۵۰

۶۔ http://www.urduvoa.com/content/muhammadi-begum_womens-rights-86750537/1140460-html06.03.2010

۷۔ قرۃ العین حیدر، 'کار جہاں دراز'، ص۔۱۵۰

۸۔ ایضاً

۹۔ ایضاً

۱۰۔ ایضاً، ص۔۱۵۰

۱۱۔ ایضاً۔ص۔۱۵۱

۱۲۔ ایضاً،ص۔۱۵۲

۱۳۔ ایضاً۔ص۔۱۵۲

۱۴۔ Minault Gail,'Women's Rights In Islam p-193

۱۵۔ ایضاً۔ص۔۱۹۵

۱۶۔ ایضاً۔ص۔۱۹۴

۱۷۔ ایضاً۔ص۔۱۹۴

Scanned with CamScanner

۱۸۔ ایضاً، ص۔ ۱۹۴

۱۹۔ گمنام خاتون، 'عورتوں کا جلسہ'، تہذیب نسواں، ۱۴ر ستمبر ۱۹۰۴ء، ص۔ ۲۹۴ تا ۲۹۵

۲۰۔ ایضاً۔ ص۔ ۲۹۵ تا ۲۹۶

۲۱۔ ایضاً۔ ص۔ ۲۹۶

۲۲۔ گیتی آرا بیگم۔ 'انڈین نیشنل کانگریس' دلّی، تہذیب نسواں، ۱ر فروری ۱۹۱۹ء

۲۳۔ ایضاً۔ ۸ر فروری ۱۹۱۹ء۔ ص۔ ۶۷

۲۴۔ سید ممتاز علی، 'دخترانِ اسلام کو پیغام'، تہذیب نسواں۔ ۷ر جنوری ۱۹۲۲ء۔ ص۔ ۹ تا ۱۰

۲۵۔ امتہ الحبیب خانم، 'تحریک سودیشی' تہذیب نسواں، ۱۴ر جنوری ۱۹۲۲ء۔ ص۔ ۹۱ تا ۲۰

۲۶۔ ایضاً

۲۷۔ تہذیب نسواں۔ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۱ء

۲۸۔ تہذیب نسواں۔ ۱۳ر فروری ۱۹۲۷ء

۲۹۔ Tharu Susie and K.Lalita-P-392

۳۰۔ اے۔ کے۔ بیگم، 'سودیشی تحریک'، تہذیب نسواں۔ ۲۱ر جنوری ۱۹۲۲ء۔ ص۔ ۴۶

۳۱۔ سیدہ اشرف، 'مسلم خواتین اور سیاسیات'۔ تہذیب نسواں۔ ۴ر نومبر ۱۹۳۹ء

ص۔ ۱۰۶۵ تا ۱۰۶۶

۳۲۔ آصف جہاں بیگم، 'سودیشی اشیاء کا استعمال'۔ تہذیب نسواں۔ ۶ر اپریل ۱۹۴۴ء۔ ص۔ ۳۲۷ تا ۳۲۸

۳۳۔ ایضاً

Scanned with CamScanner

افق اور آرزو لکھنوی

منشی دوارکا پرساد افق جو ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۳ء میں دنیا سے کوچ کر گئے، نے شعر وادب میں کچھ ایسے کارنامے انجام دیئے ہیں کہ ان کو اور ان کی خدمات کو فراموش کر پانا آسان نہیں ہوگا۔ ہم عصر یا معاصرین کا تعین پیدائش اور پھر وفات کے تناسب سے کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو سید انور حسین آرزو لکھنوی اور دوارکا پرساد افق ہم عصر قرار پاتے ہیں کیوں کہ آرزو کا سن پیدائش ۱۸۷۳ء ہے جو افق کی پیدائش سے بہت زیادہ کے فرق میں نہیں ہے۔ البتہ افق کا انتقال ۱۹۱۳ء میں ہوا جب کہ آرزو ۱۹۵۱ء میں رخصت ہوئے۔ دیکھا جائے تو آرزو اور افق کی پرورش اور نشو ونما کا زمانہ ایک ہی ہے۔ ایک ہی دور میں دونوں کی تربیت ہوتی ہے، مقام ہے لکھنؤ۔ افق نے قلیل عمر پائی اور آرزو نے طویل۔ لیکن ادب میں دونوں کی مداخلت اور دونوں کا تخلیقی سفر کم وبیش ساتھ ساتھ ہی شروع ہوتا ہے۔ ابتدا میں کوئی زیادہ وقفہ نہیں ہے۔ افق اور آرزو میں مماثلت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ افق کی ہی مانند آرزو نے نثر نگاری میں بھی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں لیکن یہاں ہم بحیثیتِ شاعر آرزو لکھنوی پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں۔

آرزو نے یوں تو تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن اُن کا اصل میدان غزل ہے۔ انھوں نے غزل کو ایک نیا روپ دیا۔ آرزو نے ہندی کے دلکش الفاظ کو بڑی ہی فنکاری اور خوبصورتی سے غزل میں استعمال کیا ہے۔ روزمرہ کے ان الفاظ کی آمیزش نے ان کی غزلوں میں ایک برجستگی اور فطری معصومیت پیدا کر دی ہے۔

کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی
جھوم کر آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی

(آرزو لکھنوی)

ڈاکٹر عصمت نیلوانصاری، خانجہان پور، لال گوپال گنج، الہ آباد

Scanned with CamScanner

ابتدائی دور کی غزلوں میں آرزو کا انداز جہاں ایک طرف کلاسیکی رچاؤ بسا ؤ لئے ہے تو وہیں دوسری طرف نئے ماحول اور تقاضوں کا شعور بھی سموئے ہوئے ہے۔ اس کا سلسلہ ان کے آخری دور کے کلام تک پہنچتا ہے جس میں رفتہ رفتہ سوز و گداز اور اثر آفرینی کا اضافہ ہوتا رہا ہے۔

وہی حکایتِ دل تھی وہی شکایتِ دل
تھی ایک بات جہاں سے بھی ابتدا کرتے

کس گل کی بو ہے دامنِ دل میں بسی ہوئی
چلتی ہے چھیڑتی ہوئی بادِ صبا مجھے

کام جو بن پڑے تو خیر، گر نہ بنے خدا پہ چھوڑ
دل میں ہیں جتنے حوصلے سب نہیں اختیار کے

(آرزو لکھنوی)

آرزو کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ملک کے موجودہ مذاق اور رجحان سے متاثر ہو کر اردو شاعری میں ایک نئے اسلوب کا اضافہ کیا۔ اس دور میں زبان کا مسئلہ ایک اہم اور نازک موڑ پر تھا اور اردو کا ''اردو پن'' بنام عربی فارسی کی جنگ سی چھڑی ہوئی تھی۔ ایسے میں آرزو نے جو منفرد اسلوب اختیار کیا وہ ایک نیا تجربہ تھا۔

جس نے بنا دی بانسری، گیت اسی کے گائے جا
سانس جہاں تک آجائے، ایک ہی دھن بجائے جا

کون جانے گا سچ کہہ دکھ اپنا
ہنستے جاتے ہیں کہتے جاتے ہیں

(آرزو لکھنوی)

آرزو کے تعلق سے چند باتیں بڑی اہم ہیں کہ انھوں نے شاعری کے پرانے روایتی انداز سے انحراف کیا، زبان کو بوجھل ہونے سے بچانے کی ہر کوشش کی یہاں تک کہ کہیں کہیں

Scanned with CamScanner

عامیانہ پن بھی آ گیا اور ان سے بھی زیادہ اہم یہ کہ تمام سلاست اور روانی کے باوجود عشقیہ مضامین کے برتنے میں سنجیدگی اور متانت کا دامن چھوٹنے نہیں پایا۔

دراصل حالی کی تنقید کے بعد اردو غزل پر پے در پے اعتراضات کا ایسا سلسلہ چل پڑا اور اس کے ساتھ ہی نظم جدید کے رواج نے غزل کی مقبولیت کو ایسی چوٹ پہنچائی کہ بعض لوگوں نے غزل کے باقی رہنے پر ہی سوال اٹھانے شروع کر دیئے۔ ان وقتوں میں جن لوگوں نے غزل کا بھرم رکھا اور نظم کے مقابلے میں غزل کی صلاحیتوں کو نمایاں کیا ان میں آرزو لکھنوی کا نام بھی شامل ہے اور اس اعتبار سے لکھنؤ میں جہاں اردو غزل اس زمانے میں محض بنے بنائے سانچے میں چل رہی تھی اور بہت محدود ہو کر رہ گئی تھی آرزو نے غزل کی ندرت اور تازگی واپس لوٹانے کو، غزل کے دامن کو وسعت دینے کے لئے اپنی زندگی اور اپنا فن وقف کر دیا۔

ہے غزل ہی شاہراہِ شاعری
ہے غزل ہی درس گاہِ شاعری
ہے یہی اول یہی آخر سبق
دفتر کل ہیں اسی کے دو ورق
جلوہ افروز جہان فن ہے یہ
امتحاں گاہِ کمالِ فن ہے یہ

(آرزو لکھنوی)

آرزو کی شاعری کے متعلق مرزا جعفر حسین اپنی کتاب ''بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں'' میں لکھتے ہیں؛

''اس دور میں ندرت خیال کے ساتھ اسلوب بیان کا بھی خاص لحاظ رکھا جاتا تھا۔ ہر شاعر اپنے شعر کو نوک پلک سے درست رکھنے کا قائل تھا۔ معانی، سلاستِ بیان اور زبان کی سادگی کے خصوصیات شعر کے

Scanned with CamScanner

لئے ضروری تھے۔ پھر بھی فارسی اور عربی الفاظ کثرت سے رائج تھے۔ شرفا کی زبان پر، روزمرہ کی گفتگو میں بھی، ثقیل و دقیق عربی و فارسی کے الفاظ چڑھے ہوئے تھے۔ فارسی اضافتیں معنویت و لطافت شاعری کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھیں۔ آرزو مرحوم نے اول الذکر خصوصیات کو قبول کیا اور صرف اردو کی ٹکسالی زبان استعمال کر کے اپنی زبان دانی کا سکّہ بٹھا دیا تھا۔ ان کے کلام میں ایسے اشعار کی بہتات ہے جن میں نہ عربی و فارسی کے دقیق الفاظ ہیں اور نہ فارسی اضافتوں سے کام لیا گیا ہے، لیکن پھر بھی ان میں کا قریب قریب ہر شعر معانی و بیان کے اعلیٰ محاسن کا حامل ہے۔''

(''بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں'' از مرزا جعفر حسین، ص ۲۰۷)

غرضیکہ آرزو لکھنوی نے اردو غزل کو ایک نیا روپ دیا اس کو ایسے دور میں سنوارا جب وہ نازک حالات سے گزر رہی تھی۔ آرزو کا کلام اپنے لفظیاتی تناسب اور روزمرہ کی آمیزش کے لحاظ سے منفرد ہے اور یہ انفرادیت ان معنوں میں اور بھی اہم ہو جاتی ہے کہ آرزو کا تعلق دبستانِ لکھنؤ سے ہے۔

کتابیات:

''داستانِ تاریخِ اردو'' از حامد حسن قادری

''اردو ادب کی تنقیدی تاریخ''، از سید احتشام حسین

''غزل اور مطالعۂ غزل'' از ڈاکٹر عبادت بریلوی

''ولی سے اقبال تک'' از ڈاکٹر سید عبداللہ

Scanned with CamScanner

کلامِ اقبال میں حضرت آدم علیہ السلام

حضرت آدم صفی اللہ سب سے پہلے انسان، خلیفۃ اللہ فی الارض، آج کی دنیا کے تمام لوگوں کے باپ، اوّلین پیغمبر جن سے یہ دنیا آباد ہوئی۔ آپؑ کا ذکر قرآن کریم پچیس مرتبہ آیا ہے۔[1]

علامہ نے ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر مختلف واقعات کے سلسلے میں کیا ہے، جس میں تخلیق آدم سے لے کر آدم کے جنت سے نکالے جانے تک کے تمام واقعات کو انہوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ قرآن میں ہے۔ (خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ) الرحمٰن، آیت ۱۴

اس سلسلے میں جہاں علامہ اقبال تخلیق آدم کے ذکر کو سادہ، پرکار اور طنزیہ اسلوب میں بیان کرتے ہیں وہاں وہ قرآن کے ارشادات ''اور جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس (عزازیل) کے اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور داخل ہو گیا وہ کفار (کے ٹولہ) میں۔'' (سورۃ البقرہ۔ آیت ۳۴) کو بھی منفرد انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اقبال اثبات و نفی پر قائم اس واقعے کا استعمال عصرِ حاضر کے مسلمانوں پر کرتے ہوئے دلچسپ معنی پیدا کرتے ہیں۔ بالخصوص ابلیس کے طرز کو موزوں قرار دیتے ہیں۔ ان واقعات سے متعلق اقبال کا انداز ملاحظہ ہو۔

باندھا مجھے جو اس نے تو چاہی مری نمود
تحریر کر دیا سرِ دیوانِ ہست و بود

(شمع، بانگِ درا)

گوہر کو مشت خاک میں رہنا پسند ہے
بندش اگرچہ سست ہے، مضموں بلند ہے

(شمع، بانگِ درا)

اے شمع! انتہائے فریب خیال دیکھ
مسجودِ ساکنانِ فلک کا مآل دیکھ

---

[1] محمد شاہد خان، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

Scanned with CamScanner

(شمع، بانگِ درا)

اس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے
تھا جو مسجودِ ملائک یہ وہی آدم ہے؟

(جوابِ شکوہ، بانگِ درا)

پیکرِ نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا
اس کو میسر نہیں سوز و گدازِ سجود

(بالِ جبریل)

حرفِ استکبار میرے سامنے ممکن نہ تھا
ہاں مگر تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود!

(ضربِ کلیم)

ابلیس نے حضرت آدمؑ اور حوّا کو "شجرِ ممنوعہ" کھانے کے لئے بہکایا لہٰذا دونوں اس پھل کو کھانے کے خطا کار ہوئے جب کہ خدا نے انہیں اس فعل سے منع کر رکھا تھا۔ قرآن میں ہے۔ "اور ہم نے فرمایا اے آدمؑ! رہو تم اور تمہاری بیوی اِس جنت میں اور دونوں کھاؤ اس سے جتنا چاہو جہاں سے چاہو اور مت نزدیک جانا اس درخت کے ورنہ ہو جاؤ گے حد سے بڑھنے والوں میں۔" (سورۃ البقرہ آیت ۳۵)

اس خطا کے سرزد ہو جانے پر حضرت آدم اور حوا کو بہشت سے نکال دیا گیا اور کہا گیا کہ یہاں تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے۔ (وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (البقرہ، آیت ۳۶)

علامہ اقبال نے حضرت آدمؑ کی اس بے خبری، شجرِ ممنوعہ کے پھل اور باغ بہشت کے واقعات کو نت نئے انداز میں پیش کیا ہے: مثلاً

شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

(تصویرِ درد، بانگ درا)

Scanned with CamScanner

لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنت میں
پیا شعور کا جب جامِ آتشیں میں نے

(سرگذشت آدم، بانگ درا)

کچھ جو سمجھا مرے شکوے کو تو رضواں سمجھا
مجھے جنت سے نکالا ہوا انساں سمجھا

(جواب شکوہ، بانگ درا)

باغِ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے، اب مرا انتظار کر

(بال جبرئیل، غزل ۳)

جب حضرت آدمؑ نے نادم ہوکر توبہ کی (قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا انفسنا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ) (الاعراف، آیت ۲۳) بعدازاں یہی انسان خلیفۃ اللہ فی الارض کے عہدے سے سرفراز ہوا اور خدا نے اسے ملائک پر برتری عطا کی۔ قرآن میں ہے۔ (وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ) (البقرہ، آیت ۳۰)

کلامِ اقبال میں شعرا کے عمومی مزاج کے خلاف واقعات آدم کو یاسیت اور قنوطیت کے پیرائے میں بیان کرنے کے بجائے پُر امید انداز میں بیان کرتے ہیں۔ وہ انسان کے فرشتوں پر فائق ہونے اور عطا نیابت کا مستحق ہونے کے باعث روحِ ارضی کو اس کا استقبال کرتے ہوئے دکھاتے ہیں اور اپنے مختص انداز میں، تصورِ زیست کی روشنی میں نئے نئے شعر پیش کرتے ہیں: مثلاً

توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دوریِ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک

Scanned with CamScanner

(خضرراہ، بانگ درا)

قصور وار غریب الدّیار ہوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

(بال جبرئیل، غزل ۴)

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

(بال جبرئیل غزل ۴)

جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

(بال جبرئیل)

اللہ ربُّ العزت نے حضرت آدم کو فرشتوں پر فوقیت دیتے ہوئے تمام اشیا کے نام سکھا دیئے۔ قرآن میں ہے (''اور اللہ نے سکھا دیئے آدم کو تمام اشیا کے نام پھر پیش کیا انہیں فرشتوں کے سامنے اور فرمایا بتاؤ تو مجھے ان چیزوں کے نام اگر تم سچے ہو عرض کرنے لگے ہر عیب سے پاک تو ہی ہے کچھ علم نہیں ہمیں مگر جتنا تو نے ہمیں سکھا دیا ہے بیشک تو ہی علم وحکمت والا ہے۔'' (سورہ البقرہ ۳۱/۳۲)

اور رب نے حضرت آدم کی پشت سے ان کی نسل نکالی اور عقل دے کر ان سے اپنی ربوبیت کی شہادت طلب فرمائی۔ (وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْ آدَمَ مِنْ ظُھُوْرِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ وَاَشْھَدَھُمْ عَلٰی اَنْفُسِھِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْ بَلٰی شَھِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اِنَّا کُنَّا عَنْ ھٰذَا غٰفِلِیْنَ) (سورہ الاعراف، آیت ۱۷۲) ''اور (اے محبوب) یاد کرو جب نکالا آپ کے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو اور گواہ بنا دیا خود ان کو ان کے نفسوں پر (اور پوچھا) کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب؟ سب نے کہا بے شک تو ہی ہمارا رب ہے ہم نے گواہی دی یہ اس لئے ہوا کہ

Scanned with CamScanner

کہیں تم یہ نہ کہو روزِ حشر کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے۔''

علامہ نے اسی مناسبت سے ''علم الاسماء'' اور ''پیمانِ اولین''، یعنی یومِ میثاق کو وسیع معنی میں استعمال کیا ہے۔ وہ واقعاتِ ''علم الاسماء'' کو انسان کی بزرگی پر محمول کرتے ہیں اور روزِ الست سے مربوط واقعات کا تعلق اعلیٰ درجے کی بلاغت کے ساتھ فی زمانہ کے مسلمانوں سے منسلک کر کے دل آویز معنی کا حصول کرتے ہیں۔ بطورِ خاص اس دوسرے قسم کے واقعات کی علامہ کے یہاں دو سطحیں نظر آتی ہیں۔ اول وہ جس کے ذریعے اُس رنج کا اظہار کرتے ہیں کہ عہدِ حاضر کے مسلمانوں نے ''قصۂ پیمانِ اولین''، یعنی ''یومِ میثاق'' کو بھلا دیا ہے تو دوسری جانب یہ موقف پیش کرتے ہیں کہ مومن کے لئے صرف شرابِ اَلَستُ کا سرور یعنی اقرار ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ پیمان مجاہدانہ حرارت کا متقاضی بھی ہے۔ دونوں واقعات سے متعلق شعر دیکھئے:

سنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے
بُھلا یا قصۂ پیمانِ اولیں میں نے

(سرگذشتِ آدم، بانگ درا)

یہ ہیں سب ایک ہی سالک کی گفتگو کے مقام
وہ جس کی شان میں آیا ہے ''علم الاسما''!

(ضربِ کلیم)

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں
بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست!

(شکست، ضربِ کلیم)

گو کہ کلامِ اقبال میں ذکرِ آدم یا واقعاتِ آدم بشریت کے مقام سے متعارف کراتے ہیں اور علامہ نے ان واقعات کو نئے نقطۂ نظر سے آشنا کروا کر اپنے بلند افکار کی ترجمانی کی ہے۔ یہ امورِ فن انہیں اپنے متقدمین اور معاصرین سے ممتاز کرتا ہے۔

Scanned with CamScanner

لکھنو کی عزاداری اور اس سے وابستہ چند پہلو

جب ایران کے باشندے اپنی سرحد سے نکل کر دکن کی سرحد میں داخل ہوئے تو وہاں اپنی تہذیب وثقافت کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ اسی طرح جب دکن کے باشندے دوسرے شہر یا صوبے میں داخل ہوئے تو ان کے ساتھ بھی ان کی اپنی تہذیب تھی۔ تہذیبوں کے اس لین دین میں ایک اہم رسم عزاداری کی تھی۔ جس کی بنیاد مکمل طور پر ایران میں پڑی تھی، لیکن حکومت کی تبدیلی اور نقل مکانی نے اس کو ایک سرحد سے دوسرے سرحد میں داخل کر دیا۔

لکھنو میں عزاداری کا آغاز ۱۷۷۵ء میں آصف الدولہ کے دور حکومت میں خیال کیا جاتا ہے، جب اس نے لکھنو کو اپنا پایۂ تخت بنایا لیکن یہ بات قیاس پر قائم ہے، کیونکہ آصف الدولہ سے پہلے لکھنو میں شجاع الدولہ، اپنے عہد میں امام باڑے تعمیر کرا چکے تھے۔ جن میں تعزیہ داری ہوتی تھی [۱] یہ الگ بات ہے کہ شجاع الدولہ کے بعد جب آصف الدولہ تخت نشین ہوا تو اس نے اپنا پایۂ تخت فیض آباد سے لکھنو منتقل کر دیا۔ [۲] چونکہ اس وقت کے لکھنو کے فرمانرواں ایرانی نسل سے تعلق رکھتے تھے اور عزاداری ان کی وراثتی تہذیب تھی اس وجہ سے لکھنو میں عزاداری کی تہذیب نے تیزی سے فروغ پایا۔ ڈاکٹر مسیح الزماں لکھتے ہیں کہ:

> ''عزاداری اس وقت ایک اہم سماجی سرگرمی تھی جس میں آلِ رسول سے محبت وعقیدت کے علاوہ لوگوں کے جذبۂ عمل اور قوت اظہار کے لئے ایک میدان تھا۔ گھر گھر مجلسیں ہوتی تھیں۔ جلوس نکلتے تھے۔ تعزیے اُٹھتے تھے۔ ان میں بہت سے اجتماع تو ایسے تھے جنکی تیاری سال بھر ہوتی تھی اور لوگ بھی اس کا انتظار کیا کرتے تھے۔ رات دن اس کے چرچے ہوتے۔ مقابلہ اور مسابقہ ہوتا۔ تحسین وتنقیص کے پہلو نکالے جاتے۔ اس ماحول نے مل جل

کائنات انصاری، ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

Scanned with CamScanner

کر مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے لیے سازگار فضا پیدا کر دی۔'' ۳

اس کے علاوہ ایک اور خاص وجہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس دور کے لکھنو میں فرقہ اور مذہب کی کوئی صورت نہیں تھی بلکہ مشترکہ تہذیب کی روایت قائم تھی۔ چنانچہ لکھنو کی عزاداری میں صرف مسلمان ہی شامل نہیں ہوتے تھے بلکہ مختلف مذاہب کے لوگ یہاں کی عزاداری، تعزیہ اور جلوس میں نظر آتے تھے، گویا لکھنو میں ماہِ محرم ایک تہذیبی جلسے کی حیثیت سے منایا جاتا تھا۔ ماہِ محرم قمری کلنڈر کا پہلا مہینہ ہے۔ محرم کی دسویں تاریخ کو کربلا کے میدان میں امام حسینؓ اور ان کے بہتر رفقا کو شہید کر دیا تھا۔ اس واقعہ کو ہندوستان کے تمام مسلمان ہر سال ماہِ محرم کے شروع ہوتے ہی پہلی تاریخ سے دسویں تاریخ تک ایک طرح سے سوگ مناتے ہیں۔ گویا دنیا کے تمام عیش و آرام سے محروم کر دیئے گئے ہوں۔

لکھنو کے حکمرانوں نے کئی امام باڑے تعمیر کرائے، جہاں وہ خود محرم کے دنوں میں عوام کی طرح سیاہ پوش ہو جاتے اور غم زدہ جماعت کے ساتھ برہنہ سر و پا ہو کر ماتم کرتے، سینہ کوبی کرتے اور نوحہ پڑھتے ہوئے جلوس کے ساتھ نکلتے۔ اور سر پر پروں کا تاج رکھتے ۴ اور عورتوں میں رواج تھا کہ محرم کا چاند نظر آتے ہی اپنی کلائیوں کو سونی کر لیتیں۔ مرزا جعفر حسین لکھتے ہیں:

> ''محرم کا چاند نمودار ہوتے ہی سارا ماحول بدل جاتا تھا۔ عورتیں اور مرد سب ہی سیاہ پوش ہو جاتے یا سبز لباس پہنتے تھے۔ خواص و عوام سب کی مستورات چاند دیکھ کر فوراً تعزیہ خانے میں جا کر اپنے ہاتھوں کی چوڑیاں ٹھنڈی کرتی تھیں اور سب زیور اُتار دیتی تھیں۔ یہ طریقہ سوگ نشین ہونے کی پہلی منزل تھی۔'' ۵

عزاداری سے وابستہ ایک حصہ ''مہندی'' کا ہے۔ مہندی کا رواج سب سے پہلے نصیرالدین حیدر (۱۸۳۷ء - ۱۸۲۷ء) کے عہد میں خیال کیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے مہندی کا تصور کہیں نہیں ملتا۔ ۶ مہندی ایک تاریخی روایت کی یاد میں اٹھائی جاتی ہے۔ اس کی روایت

Scanned with CamScanner

یہ ہے کہ جس دن حضرت امام حسین کے بھتیجے حضرت قاسم کی شہادت ہوئی تھی ٹھیک اس سے ایک روز قبل شب کو حضرت امام حسین نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہ کبریٰ کی شادی حضرت قاسم سے کر دی تھی۔ اس شادی کی تقریب کی یاد میں ہی محرم کی ساتویں تاریخ کو ایک جلوس بڑے تزک و احتشام کے ساتھ نکالا جاتا ہے۔ اِسی جلوس کو مہندی سے تعبیر کرتے ہیں۔

مہندی کی آمد کے سبب رات سے ہی تمام امام باڑوں میں غیر معمولی روشنی اور سجاوٹ کے اہتمام کئے جاتے ہیں۔ صدہا شمعیں اور رنگا رنگ جھاڑوں کی روشنی سے امام باڑے چمک اٹھتے ہیں۔ امام کی مزار پر بھی سجاوٹ ہوتی ہے۔ اس کی سجاوٹ کا ذکر ڈاکٹر سیّد صفدر حسین نے اس طرح کیا ہے :

> ''مزارِ مبارک کے سامنے ایک طرف تو ایک بڑے شیر کی شبیہہ رکھی ہوتی ہے اور دوسری طرف دو مچھلیاں جن کے سر باہم ملے ہوئے اور ایک دوسرے کی طرف جھکے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہاں ایک سخت طلائی و نقرئی علموں کے جواہر نگار پٹکے ہوا میں لہلہاتے ہیں جن کے نزدیک دَرِ کعبہ، قُبۂ مبارک، خیمہ و خرگاہِ حسینؓ وغیرہ کی چاندی کی شبیہیں اور واقعہ کربلا کے نقرئی نقشے ایک چاندی کی میز پر رکھے ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر رقیق القلب حضرات پر رقّت طاری ہو جاتی ہے۔'' [۷]

اس کے بعد باہر توپوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ یہ اشارا ہوتا ہے کہ اب آرائش کیا ہوا شادی کا تخت آئے گا۔ یعنی مہندی، امام باڑے میں مہندی داخل ہونے والی ہے اس کے بعد چاروں طرف بالکل سناٹا چھا جاتا ہے۔ اس مہندی کے جلوس میں ہاتھی، اونٹ اور گھوڑے شامل کئے جاتے ہیں۔ [۸] لیکن یہ سب باہر ہی کھڑے ہوتے ہیں اور مہندی امام باڑے کے اندر داخل ہو جاتی ہے۔ مہندی کے ساتھ نقرئی کشتیوں میں ہر قسم کی مٹھائیاں، خشک میوے، پھولوں کے

Scanned with CamScanner

ہار، چھپر کھٹ اور گلدستے ہوتے جنھیں زرق و برق پوشاکیں پہنے ہوئے ملازمین لیئے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد دلہن کی نُقرئی پالکی اندر داخل ہوتی ہے۔ جس کے بعد امام باڑے میں ایک سناٹا چھا جاتا ہے۔ دلہن کی پالکی کے پیچھے ایک جماعت سر جھکائے ماتمی لباس پہنے اور غمگین صورت بنائے امام باڑے میں داخل ہوتا ہے۔ اور اس کے پیچھے حضرت قاسم کا تابوت اور ایک گھوڑا آتا ہے۔'' چونکہ حضرت قاسم کی شادی اور شہادت ایک ہی دن واقع ہوئی تھی اس لئے سامانِ عروسی کے دوش بدوش سامانِ غم بھی ہوتا ہے۔9 اس کے بعد امام باڑے میں مجلس عزا شروع ہو جاتی ہے۔

عزاداری کا دوسرا اہم حصہ ''تعزیہ'' ہے۔ لکھنؤ کے شاہی تعزیے کی مقبولیت تو دور دور مشہور ہے۔ لیکن یہاں کے عوامی تعزیے بھی کسی شاہی تعزیے سے کم مقبولیت نہیں رکھتے۔ اس کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ جس طرح لکھنؤ کے حکمرانوں نے اپنے دور میں عزاداری اور اس سے وابستہ تمام رسوم کو فروغ دیا، اُسی طرح زوالِ سلطنت کے بعد لکھنؤ کے عوام نے بھی اپنے حکمرانوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے عزاداری کو فروغ دیا۔ چونکہ اس وقت لکھنؤ مشترکہ تہذیب کا گہوارہ تھا، اس لئے عزاداری میں دوسرے مذہب کے لوگ بھی برابر کے شریک کار ہوتے۔ وہاں کے عوام اپنے پیشوں سے متعلق تعزیے تیار کرتے تھے۔ ان پیشہ وروں کے تعزیوں کے بارے میں شیخ تصدق حسین اپنے مضمون ''لکھنؤ کے قدیم عوامی تعزیے'' میں لکھتے ہیں :

> ''پیشہ ور اہل سنت و برادرانِ ہنود اپنے اپنے پیشوں سے متعلق تعزیے تیار کرتے تھے۔ مثلاً شیرینی فروش شکر اور بتاشوں کے، بھڑ بھونجے جو اور مٹر کے، درزی کٹاؤ کے، چکن ساز چکن کے، منیہار چوڑیوں کے، کمہار مٹی کے، ندّاف کھجور اور روئی کے اور نجّار لکڑی کے نہایت دلفریب اور دیدہ زیب تعزیے تیار کرتے تھے۔ ان پیشہ وروں کے علاوہ اور لوگ بھی نہایت نفیس تعزیے بناتے تھے۔ اس قسم کے چند تعزیے یہ تھے۔ پیتل کے تعزیے، کٹاؤ کے تعزیے، مینا کاری

Scanned with CamScanner

کے تعزیے، موی ضریح متعدد سیاہ و سفید اور سرخ و سبز تعزیے، رانگہ کا تعزیہ وغیرہ وغیرہ۔" ۱۰

لکھنؤ کے وہ عوامی تعزیے جو بہت ہی مشہور و مقبول ہیں۔ ان سب تعزیوں کے پیچھے بھی ایک تاریخ ہے۔ اس تاریخ کو مرزا جعفر حسین نے اپنی کتاب "قدیم لکھنؤ کی آخری بہار" میں تفصیل سے لکھا ہے۔ یہاں پر اُن تعزیوں کا صرف نام ہی درج کرنا بہتر ہوگا۔ ان تعزیوں کا نام یوں ہے۔

۱۔ رسالدار کا تعزیہ

۲۔ لال تعزیہ

۳۔ سفید تعزیے

۴۔ پیتل کے تعزیے

۵۔ چٹائی کے تعزیے

۶۔ موی ضریح

۷۔ چھلبداروں کا تعزیہ

۸۔ چپ تعزیے

۹۔ روئی کے تعزیے

۱۰۔ چوڑیوں کے تعزیے ۱۱

یہ تمام تعزیے یوم عاشورہ اور بروزِ چہلم تال کٹورہ کی کربلا میں دفن ہونے کے لئے جاتے ہیں، لیکن اس میں سے وہ تعزیے جو مستقل طور پر بنے ہوتے ہیں اور جو ضریحیں ہوتی ہیں وہ واپس ہو جاتی ہیں۔ شاہی تعزیے صرف یوم عاشورہ اٹھائے اور دفن کئے جاتے تھے۔ اُن کے یہاں صرف دس روز تعزیہ داری ہوتی اس کے بعد مجلسیں شروع ہو جاتیں اور کوئی بھی محرمی جلوس نہیں نکلتے تھے۔

Scanned with CamScanner

تعزیوں کے بارے میں ایک تاریخی روایت قابلِ ذکر ہے، کہا جاتا ہے کہ ''تیمور بادشاہ ہر محرم میں امام حسینؓ کی مزار پر حاضر ہو کر سوگ نشین ہوتا تھا۔ ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے بعد دورانِ جنگ محرم کا چاند نمودار ہوا اور اس کے لیے مرقدِ مبارک پر پہنچنا ناممکن ہو گیا۔ تب اس نے اپنے مشیر کاروں سے استصواب کیا اور اُن کی رائے پر عمل کرتے ہوئے روضۂ مطہر کی شبیہ تیار کرائی اور اس کے حضور گریہ کناں ہو کر اپنی عقیدت مندی کو آسودہ کیا تھا۔ تعزیہ داری کی بنیاد اس طرح قائم ہوئی تھی۔'' ۱۲ اس تاریخی روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تعزیہ داری کوئی مذہبی معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہندوستان میں ہی معرض وجود میں آیا ہے۔ اور اسی ملک میں اسے مقبولیت حاصل ہے برادرانِ اہلِ سنت کے ساتھ ہی ساتھ برادرانِ اہلِ ہنود عشرۂ محرم میں اپنے اپنے یہاں تعزیے رکھتے تھے۔ لکھنؤ کی عزاداری کے سلسلے میں تصدق حسین لکھتے ہیں:

> ''لکھنؤ کی عزاداری دور دور مشہور ہے۔ نوابین اودھ کے زمانہ سے یہاں کے امرا اور رؤسا محرم کے ایام میں اپنی عقیدت مندی کا اظہار شاندار مجالس کے انعقاد، بڑے بڑے پُر تکلف حصّوں کی تقسیم اور تعزیوں کے ہمراہ طویل پُر شوکت جلوسوں سے کرتے چلے آئے ہیں۔'' ۱۳

یہاں یہ بات جانتے رہنا چاہیے کہ تعزیہ لفظ غم کے اظہار کی نشانی کے طور پر بنایا گیا تھا۔ جو حضرت امام حسینؓ کی مزار کی شبیہہ ہے اور محرم کے جلوسِ عزا میں عام طور پر سڑکوں پر نکالا جاتا ہے تاکہ دیکھنے والے محرم اور واقعۂ کربلا کی اہمیت سے واقف ہو سکیں۔ بس عزاداری کا یہی مقصد ہوتا ہے۔ لکھنؤ کے نوابی عہد میں محرم کے یہ جلوس عوام کو متاثر کرنے کے لئے نکالے جاتے تھے اور اسی کے ساتھ دیکھنے والے نوحہ و ماتم کرتے تھے۔

اس کے علاوہ مجالس وخواندگی کا دور بھی شروع ہو جاتا۔ جس میں سوز خوانی اور حدیث خوانی بہت اہم ہوتی۔ آخر میں تقسیم تبرّک کیا جاتا، جس میں عموماً شیرینی تقسیم ہوتی تھی۔ اس تقسیم

Scanned with CamScanner

اور مجلس میں مسلمان اور غیر مسلمان دونوں ہی بڑے خلوص و احترام کے ساتھ ماہِ محترم کے اس سوگ میں شامل ہوتے۔ اور اس طرح عزاداری اپنی آخری منزل کو طے کرتی۔

لکھنو کی عزاداری کا یہ ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

حواشی :

۱۔ اردو مرثیہ کا ارتقا۔ ابتدا سے انیس تک۔ ڈاکٹر مسیح الزماں۔ ص۔۱۱۳

۲۔ ایضاً، اردو مرثیہ کا ارتقا۔ ابتدا سے انیس تک۔ ڈاکٹر مسیح الزماں۔ ص۔۱۲۰

۳۔ ایضاً، اردو مرثیہ کا ارتقا۔ ابتدا سے انیس تک۔ ڈاکٹر مسیح الزماں۔ ص۔۱۲۵

۴۔ قدیم لکھنو کی آخری بہار۔ مرزا جعفر حسین۔ ص۔۳۲۴

۵۔ ایضاً، قدیم لکھنو کی آخری بہار۔ مرزا جعفر حسین۔ ص۔۳۲۵

۶۔ رسالہ ''نیا دور''۔ ستمبر ۱۹۶۴۔ ص۔۱۵۔ لکھنو کی نامی مہندیاں۔ شیخ تصدق حسین

۷۔ لکھنو کی تہذیبی میراث۔ ڈاکٹر سیّد صفدر حسین۔ ص۔۲۳۰

۸۔ ایضاً، لکھنو کی تہذیبی میراث۔ ڈاکٹر سیّد صفدر حسین۔ ص۔۲۳۱

۹۔ ایضاً، لکھنو کی تہذیبی میراث۔ ڈاکٹر سیّد صفدر حسین۔ ص۔۲۳۱

۱۰۔ رسالہ ''نیا دور'' جلد ۱۶۔ نمبر ۵۔ اگست ۱۹۶۱ء۔ لکھنو کے قدیم عوامی تعزیے۔ شیخ تصدق حسین ص۔۱۹

۱۱۔ قدیم لکھنو کی آخری بہار۔ مرزا جعفر حسین۔ ص۔۳۴۸ تا ۳۴۳

۱۲۔ ایضاً، قدیم لکھنو کی آخری بہار۔ مرزا جعفر حسین۔ ص۔۳۴۰

۱۳۔ رسالہ ''نیا دور''۔ ستمبر ۱۹۶۴۔ لکھنو کی نامی مہندیاں۔ شیخ تصدق حسین ص۔۱۵

Scanned with CamScanner

ISSN 2320-3781

Naqsh-e-Nau

2015-16

International Annual Udru Journal

Dept. of Urdu
Hamidia Girls' Degree College
Allahabad

Scanned with CamScanner